اسلام کے پیغامِ امن و آشتی اور انسانی اخوت و غمگساری کی واقعاتی تشریح

اِسلام اور عالمی اَمن و اخوّت

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
(سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حرفِ تعارُف

حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ علمی اور دینی حلقوں میں معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے ایک علمی اور تحریکی مرکز دارالعلوم دیوبند کا اہتمام تقریباً ساٹھ سال (1348ھ / 1929ء - 1403ھ / 1983ء) تک بہترین نظم ونسق کے ساتھ چلایا۔ انھیں اپنے دادا حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار پر پوری گرفت حاصل تھی۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی شاہکار کتاب ''حُجّۃ اللّٰہ البالغہ'' امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے دارالعلوم دیوبند میں پڑھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں علمی وعصری تقاضوں کی روشنی میں مشکل دینی مضامین کو حکیمانہ اسلوب پر بیان کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ اسی لیے قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرنے کا خاص ملکہ آپ کو حاصل تھا۔ گفتگو کا ربط اور بے ساختہ پن ایسا ہے کہ ان کی تحریر اور تقریر میں بات سے بات نکلتی ہے اور ایک کڑی دوسری کڑی سے جڑتی چلی جاتی ہے۔ اسلوب منطقی اور معروضیت پر مبنی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھیں دینی علوم پر پورا شرح صدر حاصل ہے۔

زیرِ نظر پمفلٹ مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کا ایک خطبہ ہے، جو انھوں نے رابطہ عالم اسلامی کی ایک عالمی امن کانفرنس منعقدہ مکہ مکرمہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ ہم نے یہ خطبہ ''مجموعہ رسائل حکیم الاسلام'' سے لیا ہے۔ اس خطبے کے مضامین کا عصری مسائل سے گہرا تعلق ہے۔ مضمون کی افادیت کی بنا پر شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کو اس کی اشاعت کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اس خطبے میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ اس لیے سہولت کی خاطر راقم نے مشکل الفاظ کا مفہوم قوسین میں واضح کر دیا ہے۔ آیات واحادیث کا ترجمہ اور حوالہ جات بھی درج کر دیے ہیں۔ امید ہے اس سے قارئین کو سہولت ہوگی۔

محمد ناصر ناظم: شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ نمبر
حرفِ تعارف	3
حرفِ اوّل	7
اسلام اور عالمی امن کی اہمیت	9
اسلام؛ عالمی امن کا ایک پروگرام دیتا ہے	10
اسلام کے اصول وفروع کا امن سے تعلق	10
''ایمان'' سے امن کے آثار وثمرات	11
''اسلام'' سے سلامتی اور امن کا اظہار	11
ایمان واسلام انسان کو امن کا مجسمہ بناتے ہیں	12
ایمان کی حقیقت امانت ہے	12
اسلام کا پُر امن عملی پروگرام	13
(الف) سلام کرنے کا حکم	13
(ب) دوسروں کی ایذا رسانی سے بچنا	15
(ج) تمام انسانوں کی جان اور مال کی حفاظت	16
(د) راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا	17
(ہ) عوامی مقامات پر گندگی ڈالنے سے بچنا	17

(و) امانت کا حکم اور فتنے کی روک تھام	18
(ز) فتنہ پروری کی خرابیاں	18
(ح) تین دن سے زیادہ باہمی رنجش کی ممانعت	20
(ط) امن عالم کے لیے ایک پوری سورت کا نزول	20
(ی) اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے دو دائرے	20
i۔ اسلامی اجتماعیت کے تقاضے	21
ii۔ انسانی اجتماعیت کے تقاضے	23
عالمی امن کے حوالے سے دیگر مذاہب کی حالت	25
اسلام میں امن کی اساس وحدتِ انسانی ہے	25
اسلام امن کے عالمی فطری اصول کا داعی ہے	26
امنِ عالم اور سیرتِ نبویؐ	27
نبوت ملنے سے پہلے بھی آپؐ ''امین'' تھے	27
حضورؐ کا اعلانِ امن	29
امن کے قیام میں اسلامی معاشرت کے اثرات	29
(الف) نماز میں امن کے تقاضوں کی رعایت	30
(ب) حج میں امن کے تقاضوں کی رعایت	30
(ج) جہاد کی روح؛ قیامِ امن	31
(د) اجتماعیت کے ہر دائرے میں عالمی امن	31
(ہ) امن کی ضد بے جا تعصب کی ممانعت	32
(و) عدل اور قانونی مساوات؛ وحدتِ انسانیت اور امن کا نور	33

(ز) بے جا تعصب کے کئی پہلو اور اُن کی نفی	33
i۔ شخصی عقیدت پر مبنی بے جا تعصب کی ممانعت	33
ii۔ وطنی محبت پر مبنی بے جا تعصب کی ممانعت	34
iii۔ قومی محبت پر مبنی بے جا تعصب کی ممانعت	35
iv۔ رنگت کے اختلاف کی بنیاد پر بے جا تعصب کی نفی	36
v۔ نسل اور نسب کی بنیاد پر بے جا تعصب کی نفی	36
انسانوں میں فرقِ مراتب اَخلاق و کردار کے سبب ہے	37
vi۔ ظالم حکمرانوں کے طبقاتی تعصب کی ممانعت	39
انبیا علیہم السلام بھی قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے والے ہوتے ہیں	39
حکمرانی کی بنیاد خلافتِ ربانی ہے، نہ کہ آمریت	41
حکمرانوں کو منصبی فوقیت ہوتی ہے، نہ کہ ذاتی بالادستی	42
vii۔ سماجی طبقاتی تعصب کی ممانعت	42
viii۔ عورت پر بے جا مردانہ تعصب کی ممانعت	45
کمزور طبقات کو طاقت ور بنانے کا حکم	49
اسلام کی امن آفرین تعلیم تمام انسانوں کے لیے ہے	50
امنِ عالم کے نام نہاد نظام ہائے حیات	51
اسلام کے فطری سوشلزم کی اہمیت	52
آخری نصیحت	53
خطبے کے نکات کا خلاصہ	54
حوالہ جات	56

حرفِ اوّل

اکیس ویں صدی عیسوی کی آمد دنیا کے لیے سماجی حوالوں سے بہت سی حشر سامانیوں کا پیغام لے کر آئی۔ گو سائنسی میدان میں کئی پیش قدمیوں کی حوصلہ افزا خبریں بھی منظر عام پر آئیں، لیکن یہ سائنسی ترقیات، انسانیت کے حق میں استفادے کا نظام نہ ہونے کے سبب مجموعی طور پر کوئی مسرت افزا ماحول پیدا نہ کر سکیں۔ کیوں کہ سامراجی نظام، سائنسی ترقیات سے انسانوں کو مزید زیر بار رکھنے اور ان پر مسلط طوقِ غلامی کو مزید تنگ کرنے کا کام لیتا آرہا ہے۔

اس صدی میں مذہب کے حوالے سے تشدد اور قتل و غارت اور انسانی عزت و ناموس کی پامالی کے مظاہر کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت فروغ دیا گیا، جس کے ہدایت کار اور منصوبہ ساز مغرب کے ایوانوں میں ہیں، جب کہ ان منصوبوں کے لیے میدان مسلم دنیا میں تیار کیا گیا اور مسلمان اس میں اپنے جذبات کے ہاتھوں اَسیر ہو کر ایندھن کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔

بدقسمتی سے دنیا میں مغرب کے مسلط کردہ نوآبادیاتی دور میں مسلمانوں کے فکری وِرثے پر بھی رہزنی کی گئی اور اسلام کے نام پر ایک مبہم، رومانوی، خیالی اور جذباتی مذہب کی آب یاری کی گئی۔ جس میں مذہبی عنوانات خلافت، جہاد وغیرہ کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ اور پھر ان کے نتائج سے سرد جنگ کے دور میں بھرپور فائدہ بھی اٹھایا گیا۔ اور دین کا یہ فکری استحصال موجودہ صدی میں ایک نئی شکل اختیار کر گیا، جس میں بہ ظاہر مغرب کے نظام اور اس کے حکمرانوں سے نفرت آمیز بے زاری نمایاں ہے، مگر اس کے نتیجے میں مذہبی عسکریت پروان چڑھی اور جنگ و جدال کے ذریعے سے ''خلافت'' قائم کرنے کے

کارواں چل پڑے۔

آج اس مذہبی عسکریت کے بارے میں مختلف ممالک میں انتظامی اقدامات پر کافی توجہ دی جا رہی ہے، مگر بنیادی مسئلہ اسلام کے حقیقی نظریے کے تعارف اور اس پر منظّم تربیت کا ہے۔ اس کے بغیر دیگر اقدامات اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں، جس کی بنا پر عالمی اَمن، محض ایک خواہش کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ آج ذرائع ابلاغ میں عسکریت کی فکر کے مقابلے پر جوابی بیانیے پر زور دیا جا رہا ہے۔ حال آں کہ اسلام کا حقیقی بیانیہ (Narrative) وہی ہے، جس کی اہمیت ایک عرصے سے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکتبِ فکر کے اہل علم اُجاگر کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلے پر جذباتی خیال آرائی پر مبنی بیانیے کی ترویج کی گئی۔ اس میں مغرب کی حکومتوں نے بھرپور فکری، ابلاغی، مالی اور عسکری سرپرستی کا کردار ادا کیا اور اسی کی کوکھ سے آج کے عسکری سیاسی بیانیے نے جنم لیا ہے۔

زیرِنظر پمفلٹ میں برعظیم کی ایک معروف علمی شخصیت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ نے اسلام کے اس بنیادی تصور کو اُجاگر کیا ہے، جو دنیا میں بلاتفریق قوم ونسل، مرتبہ و صنف اور رنگ و نسب اور مذہب و فرقہ، ہمہ گیر عالمی اَمن اور انسانی اخوت پر مبنی معاشرے کی اساس قرار پاتا ہے۔ اور یہی معاشرہ ماضی میں دنیا میں حقوق انسانی کی پہچان رہا ہے۔ اسلام کا اَمن واَخوت کا تصور اور نظام ہی اسلام کا وہ بیانیہ (Narrative) ہے، جس کی ترویج واشاعت اور اس پر نوجوانوں کی سوچ منظّم کرنے کی ضرورت ہے۔

اُمید ہے کہ زیرِ نظر پمفلٹ کا مطالعہ بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کا باعث ہوگا اور مستقبل کے لیے حوصلہ افزا لائحۂ عمل کے لیے ذہنوں کو مہمیز دے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن
چیئرمین شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن
14-01-2016

اسلام اور عالمی اَمن واُخُوّت

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم
الحمد للّٰہ و سلام علیٰ عبادہٖ الّذین اصطفیٰ!

(تمہیدی کلمات اور جذباتِ تشکر کے اظہار کے بعد فرمایا:)

اسلام اور عالمی امن کی اہمیت

میں نے ''اسلام اور عالمی امن'' کا عنوان اسی لیے اختیار کیا کہ یہ موضوع جہاں صرف اسلام کا ہی خاص حصہ ہے، جس میں اس کا کوئی سہیم (حصہ دار) و شریک نہیں، وہیں وہ تعمیم اِخاء ومودّت (عام بھائی چارہ اور محبت) اور تعمیم (عمومی) تعلیم وتبلیغ کا بھی سب سے زیادہ مؤثر راستہ ہے۔ اس لیے ذیل کی یہ چند سطریں باوجود اپنی بے بضاعتی (کمزوری) اور قلتِ علم (کم علمی) کے اسی موضوع سے متعلق پیش خدمت ہیں۔ شاید کہ درجۂ قبولیت پاسکیں۔ **و ما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز۔**

اسلام ایک اَمن دوست، اَمن پرور اور اَمن آفریں (اَمن پیدا کرنے والا) دین ہے، جس کے ایک ایک اَمر و نہی (کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے)، حکم وحکمت (قانون اور اس پر عمل درآمد کی حکمتِ عملی) اور علت و مصلحت، یعنی اَمن ومحبت اور اَخوت ومودّت (باہمی بھائی چارہ اور محبت) اسی طرح پیوست ہے، جیسے گلاب کی پنکھڑیوں میں خوشبو اور ایک عمدہ پھل میں بہترین ذائقہ رَچا ہوا ہوتا ہے۔ نیز اس کے ایک ایک جزو سے بداَمنی اور انتشار پسندی اسی طرح منقطع (الگ ہوکر) رہ گئی ہے، جس طرح سورج سے ظلمت اور

چمکتے ہوئے دن سے اندھیرا دور ہے۔

اسلام؛ عالمی امن کا ایک پروگرام دیتا ہے

دنیا کے مذاہب کے بارے میں یہ زبانِ زدنعرہ کہ: ''دنیا کے کسی بھی مذہب نے بدامنی اور انتشار اور فرقتِ باہمی (آپس کی دُوری) پسند نہیں کی، بلکہ اَمن ہی کا پیغام دیا ہے، جس میں اسلام کی خصوصیت نہیں۔'' اگر کسی حد تک واقعتاً بھی فرض کرلیا جائے تو اسلام کا یہ امتیاز بہرحال پھر بھی ایک امتیاز ہی رہے گا کہ اَور (دیگر) مذاہب نے اگر اَمن کا پیغام دیا ہے تو اسلام نے اَمن کا صرف پیغام ہی نہیں دیا، بلکہ (اس پر عمل درآمد کا) مکمل پروگرام (اور نظام) بھی دیا ہے، جس سے اَور (دیگر) مذاہب کم وبیش خالی ہیں۔

پھر جس حد تک اَور مذاہب میں اَمن کی کوئی دعوت موجود ہے تو وہ قومی یا مقامی یا وطنی اور طبقاتی حدود سے آگے نہیں ہے، لیکن اسلام اَمن کا پیغام محض مقامی، وطنی، قومی اور ملکی حد تک لے کر نہیں آیا، بلکہ عالمی اور آفاقی حد تک دنیائے انسانیت اور ساری اقوام و اُمم (اُمتوں) کو باہم شیر وشکر بنا کر ایک پلیٹ فارم پر جمع کردینے کے لیے آیا ہے اور اس نے ایسا کر کے دکھلا بھی دیا ہے۔ حتیٰ کہ عالمی اخوت ومساوات اور عالمی اَمن کے نام پر اس نے حکومتوں تک کی شیرازہ بندی کی ہے، جس سے اس کی تاریخ روشن ہے۔

ہمیں اصولاً اس سے انکار نہیں ہے کہ دنیا کے مذاہب نے انتشار اور بدامنی کو پسند نہیں کیا، لیکن مذاہب کی تاریخ سے یہ اندازہ کرلینا کچھ مشکل نہیں کہ اَور مذاہب نے اگر فتنۂ انتشار سے بچایا ہے تو اسلام نے فتنۂ انتشار کو جڑ بنیاد سے مٹایا ہے اور انسانی زندگی کے کسی بھی گوشے میں انتشار وفرقت کے جراثیم کو پلنے کا موقع نہیں دیا ہے۔

اسلام کے اصول وفروع کا امن سے تعلق

اس نقطہ نظر سے اسلام کے اصول وفروع (اصولی اور ذیلی قوانین) کو اگر سرسری نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو مجموعی حیثیت سے پورا اسلام اَمن وآشتی (سلامتی) کا پیغام اور اخوت وملنساری اور اَمن وسکون کا ایک مکمل پروگرام اور عالمی اَمن کا ایک ایسا فطری

نظام نظر آئے گا کہ مسلمان ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا اس پر آئے بغیر کبھی بھی اَمن وسکون کا مونہہ نہیں دیکھ سکتی۔ اور نہ صرف اس کی تعلیمات و اندازِ تربیت، بلکہ اس کے اسم و رسم (فکروعمل) تک میں آشتی (سلامتی) وسکون کی آب یاری دکھائی دے گی۔

مثلاً اسلام دو ہی چیزوں کے مجموعے کا نام ہے: ایک عقیدہ اور ایک عمل۔ عقائد کے مجموعے کا نام ''ایمان'' ہے، جو قلب کی گہرائیوں میں مخفی (چھپا) رہتا ہے اور اعمال کے مجموعے کا نام ''اسلام'' ہے، جو ہر بدن کے اعضا پر نمایاں ہوتا ہے۔ اسلام کے ان دونوں بنیادی عنوانوں کو دیکھا جائے تو ان کے ان ناموں میں ہی اَمن پیوست (ملا ہوا) ہے۔

''ایمان'' سے امن کے آثار وثمرات

اگر ایمان کے لفظ کو دیکھو جو اس دین کا اعتقادی عنوان ہے تو اس کا مادہ (لفظی ساخت) ہی اَمن ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جہاں بھی پہنچے گا، اپنے مادے کو ساتھ ہی لے کر پہنچے گا، جو اَمن ہے اور اس سے اَمن ہی کے آثار اور اَمن ہی کے ثمرات نمایاں ہوں گے، جو خود اَمن ہوں گے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝ (82:6)

(جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں ظلم کی ملاوٹ نہیں کی، تو انھی کے لیے امن ہے اور وہی سیدھے راستے پر چلنے والے ہیں۔)

پس اس دین کا بنیادی عنوان ''ایمان'' ہی اَمن کا ایک مستقل اعلان ہے۔

''اسلام'' سے سلامتی اور امن کا اظہار

ادھر اسلام کے لفظ کو دیکھا جائے، جو اس دین کا عملی سرنامہ اور عنوانی لقب ہے تو اس کا مادہ (لفظی ساخت) ''سلم'' ہے، جس کے معنی ہی سلامتی اور اَمن کے ہیں۔ جہاں بھی اسلام پہنچے گا، اپنے مادے سمیت ہی پہنچے گا اور وہ سلامتی اور اَمن دوست ہوگا۔ اسی لیے تو قرآن حکیم نے اسلام میں داخل ہونے کو سِلْم وسلامتی میں داخل ہونے سے تعبیر کیا

ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ (208:2)

(اے ایمان والو! سلامتی یعنی اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو۔)

جس سے اس کی اَمن پروری اس کے بنیادی عنوانوں ہی سے کھل جاتی ہے اور ظاہر ہے جس کی اَمن دوستی کے عنوان اور (اُس کے) اسم و رسم (فکر و عمل) ہی سے عیاں (ظاہر) ہے تو اس کی حقیقت اَمن پروری کے سوا اَور کیا ہوسکتی ہے۔ **و من المثل السّائر، الظّاهر عنوان الباطن.** (مثل مشہور ہے کہ ظاہر، باطن کا عنوان ہوتا ہے۔)

ایمان و اسلام انسان کو امن کا مجسمہ بناتے ہیں

حاصل یہ نکلا کہ ایمان اگر انسانی قلب کو اَمن سے پُر کرتا ہے، تو اسلام کے اعمال و افعال انسان کے اعضا و جوارح اور لسان (زبان) و بیان کو سلامتی اور سلامت روی سے آراستہ کرتا ہے۔ جس سے اس کا ماننے والا اپنے ظاہر و باطن دونوں ہی کے لحاظ سے اَمن کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اسے ہم دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کرسکتے ہیں کہ ایمان و اسلام اپنے ناموں تک سے بھی اَمن و سلامتی کی دعوت لے کر آئے ہیں۔ تو وہ اپنی تعلیمات، اپنے علمی پروگراموں میں اور اپنے علمی مسائل وحقائق سے اَمن و سلامتی کو کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں۔

ایمان کی حقیقت امانت ہے

مزید غور کیا جائے تو ایمان و اسلام کے عنوانوں کا معاملہ تو بعد کا ہے۔ اس سے بھی پہلے ایمان کی اساس اور زمین، جس پر ایمان کا رنگ چڑھتا اور نکھرتا ہے، ''امانت'' ہے۔ اس کے بغیر ایمان ہی نہیں بنتا۔ جیسے پھٹکری رنگ کے چڑھنے اور نکھرنے کی زمین ہے کہ اس کے بغیر رنگوں میں شگفتگی ہی پیدا نہیں ہوتی یا جیسے تمام عطریات کے لیے زمین (Base) تِل کا تیل ہے کہ اسی پر ہر خوشبو جمتی ہے، دوسرے کسی تیل پر کسی خوشبو کا جماؤ

نہیں ہوتا، اس لیے عطر سازوں میں تِل کے تیل کو عطریات کی زمین کہا جاتا ہے۔ اسی طرح امانت، ایمان و اسلام کی زمین ہے، جس کے بغیر قلب میں ایمان کا رنگ ہی نہیں جم سکتا۔ چناں چہ حدیثِ پاک میں ارشاد ہے:

"لا إيمانَ لمن لا أمانة لهٗ." (1)

(جس کے اندر امانت نہیں، وہ ایمان والا نہیں۔)

اور عربیت (عربی جاننے) والے جانتے ہیں کہ امانت کا مادہ (لفظی ساخت) بھی وہی اَمن ہے۔ پس امانت جب ایمان کی اساس ٹھہری اور ایمان، اسلام کی بنیاد ثابت ہوا تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس دین کی اساس اور ابتدا ہی اَمن سے ہوتی ہے۔ یہ عنوانات خود ہی اَمن کا ایک مستقل اعلان اور سلم و مسالمت (سلامتی اور باہمی خیرخواہی) کی ایک مستقل دعوت ہیں۔

اسلام کا پُر امن عملی پروگرام

(الف) سلام کرنے کا حکم

یہاں تک تو اسلام کا علمی اور نظری حصہ تھا۔ اب اگر اس کے عملی پروگرام کی دنیا میں آیا جائے، تو ایک مسلمان کا سب سے پہلا سابقہ (واسطہ) کسی وارد و صادر (آنے جانے والے) یا راہ گیر سے پڑتا ہے تو اسلام نے اُسے تحیت (سلام کرنے) کا حکم کیا ہے۔ جیسا کہ اَور (دیگر) مذاہب و اَقوام میں تحیت (سلامتی کی دعائیں) پائی جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اَور مذاہب میں تحیت (دُعا دینے) کا رسمی اور علامتی انداز ہے۔ کچھ علامتیں رکھی گئی ہیں، جس سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ تحیت (دُعا) ہوگئی ہے، ہاتھ جوڑ لیے یا ہاتھ کی انگلی سے یا ہتھیلی سے اشارہ کردیا گیا کہ جس کے نیچے کوئی معنوی حقیقت نہیں ہوتی۔ صرف ایک اصطلاح ہوتی ہے کہ اس حرکت سے تحیت (دُعا) سمجھ لی جائے۔

مثلاً نصاریٰ کی تحیت (دُعا) ہتھیلی کو اونچا اٹھا دینے سے رکھی گئی ہے، جو ایک حرکت ہی حرکت ہے، جس میں معنی کچھ نہیں یا اسی طرح یہودی تحیت (دُعا) انگلی اٹھا دینے سے رکھی گئی ہے۔ اسی طرح مشرکین کی تحیت (دُعا) دونوں ہاتھ جوڑنے سے رکھی گئی ہے، جو

رسوم وعلامات ہیں اور کچھ نہیں۔ نہ وہ لغت ہیں کہ ان کے معنی ہوں، نہ لفظ ہیں کہ جن میں کوئی حقیقت چھپی ہو۔ نہ ان میں کسی ملنساری کی دعوت یا آشتی ومحبت کا کوئی پیغام ہے، لیکن اسلام نے تحیت (دُعا) کوئی جسمانی حرکت نہیں رکھی، بلکہ "**السّلام علیکم و رحمة اللّٰه و برکاتهٗ**" کو تحیت (دُعا) قرار دیا ہے، جس کی ابتدا ہی اول تو اللہ کے نام سے ہوتی ہے، جو خود موجبِ خیر و برکت ہے۔ پھر اس میں "**رحمة اللّٰه و برکاتهٗ**" کا لفظ اضافہ کیا گیا ہے، جس میں مخاطب کو **السّلام علیکم** میں دعا دی جاتی ہے کہ تیرے اوپر اس قدوس و سلام جل ذکرہٗ (بلند و بالا پاکیزہ اور سلامتی والی ذات خداوندی) کی حرمت و برکت نازل ہو۔ گویا سب سے پہلے مخاطب کے ذہن میں سلم (صلح) وسلامتی اور اَمن وسکون کا جذبہ بھرا جاتا ہے، تاکہ وہ بھی اس جذبہ اَمن سے پُر ہو کر تحیت کنندہ (سلام کرنے والے) کو دعا دے۔

پھر اَور (دیگر) مذاہب میں تعارف کے بعد ہی تحیت کی یہ رسمی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اگر دو غیر متعارف اشخاص (آپس میں تعارف نہ رکھنے والے) ایک جگہ سے گزریں تو وہ بلاتحیت (سلام و دعا) اجنبیوں کی طرح مونہہ پھیرے ہوئے گزر جائیں گے اور یہ رسم بھی ادا نہ کی جائے گی، لیکن اسلام کا حکم یہ ہے:

"**أفشوا السّلام علیٰ مَن عرفتَ و مَن لم تَعرف.**" (2)

(سلام کو عام کرو، خواہ کسی شخص کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔)

جس کا حاصل یہ ہے کہ سلام کرنے میں کسی سابق تعارف کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ یہ تحیت (سلام) خود تعارف ہے کہ دو اللہ کے بندے اسلامی اخوت لیے ہوئے گزر رہے ہیں، جن میں وجہِ تعارف اور قدرِ مشترک خود دین ہے، جو پہلے سے موجود ہے۔ کسی رسمی قسم کے تعارف کی ضرورت نہیں، بلکہ اس حاصل شدہ تعارف کے ہوتے ہوئے کسی مزید تعارف کا انتظار ایک تحصیل حاصل (موجود چیز کی تلاش) ہے، جو لایعنی (بے معنی) ہے۔ اسی کے ساتھ اس میں اجنبیت اور بیگانگی کی نفی کے ساتھ ملنساری بھی ہے، تاکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے سے اجنبی اور اپنے سے بعید (دُور) نہ سمجھے۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی امر ہے کہ ہر ایک فرد سلام کرنے میں ابتدا کرنے کی کوشش

کرے۔ دوسرے کے سلام کا منتظر نہ رہے کہ یہ خود بینی اور کبر (بڑا سمجھنا) ہے، جو انسان کے حق میں بدترین رذیلہ (بُری عادت) اور فساد انگیز جذبہ ہے، جس سے اَمن اور آشتی میں خلل پڑتا ہے، جس سے یہ بھی صاف واضح ہے کہ اسلامی تحیت (سلام و دعا) میں محض مخاطب کی ہی خیرخواہی پیش نظر نہیں ہوتی کہ اسے سلامتی کی دُعا دی جائے، بلکہ خود کی بھی ایک عظیم اصلاح مخفی ہے اور وہ ازالۂ کبر (تکبر کا علاج) ہے کہ جس سے امنِ باہمی اور سلم ومسالمت (صلح وموافقت) میں رخنہ پڑتا ہے۔

چناں چہ حدیثِ نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"البادی بالسّلام بریء من الکِبَر." (3)

(سلام میں ابتدا کرنے والا تکبر سے بری ہوجاتا ہے۔)

غرض مسلمان جیسے تحیت کے راستے سے تعلق مع اللہ یعنی ایمان باللہ اور اسلام للہ یا بالفاظِ دیگر اَمن وسلامتی کے داعی تھے اور دین کی ابتدا ہی اعلانِ اَمن وسلامتی سے کر رہے تھے، ایسے ہی تعلق مع الخلق (مخلوق کے ساتھ تعلق) کے بھی تحیت سے داعی ہوتے ہیں کہ ملاقات کی ابتدا ہی السّلام علیکم یعنی سلم (صلح) وسلامتی، اَمن واَمان ہی کے کلمات سے کرتے ہیں، جو خود امنِ باہمی کی ایک مستقل دعوت اور آپسی ملنساری کا پیغامِ عام ہے۔ حتیٰ کہ بعض حضرات صحابہؓ کسی منزل تک جانے کے لیے مختصر راستے کو چھوڑ کر جو شور وشغب سے بھی خالی ہوتا تھا، طویل راستہ، حتیٰ کہ بازار کا راستہ اختیار فرماتے تھے، جو شور وشغب (رش) کا مخزن (مرکز) ہے۔ وجہ یہ ظاہر فرماتے تھے کہ اس راستے سے آمدورفت کی وجہ سے کثرت سے سلام کرنے کی نوبت آئے گی، جس سے ہمیں سلامتی کی دعا دینے اور لینے کی توفیق ہوگی۔ نیز مسلمانوں کے ساتھ ملنے جلنے اور انھیں دعا دینے اور لینے کے علاوہ اُن کی اور اپنی اَخلاقی اصلاح اور کبر ونخوت (تکبر وگھمنڈ) سے تزکیے کا موقع بھی ملے گا کہ اس سے بڑھ کر افادہ واستفادۂ باطن (دل سے فائدہ پہنچانا اور فائدہ حاصل کرنا) اَور کیا ہوسکتا ہے۔

(ب) دوسروں کی ایذا رسانی سے بچنا

پھر تحیت (سلام و دعا) دو مسلمانوں کے مل جانے اور اس عام واجمالی پیغامِ سلامتی و

دعائے برکت و رحمت دینے کے بعد اسلام نے اپنے پیروؤں کو جس رذیلہ (بداَخلاقی) سے بچایا ہے، وہ دوسروں کی ایذا رسانی (تکلیف پہنچانا)، جو سلم (صلح) وسلامتی اور اَمن باہمی کی راہ میں ایک زبردست رُکاوٹ تھی۔ اور تعلیم دی گئی:

"المُسلِم مَن سلِم المسلمون من لسانہٖ و یدہٖ." (4)

(مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ اور صحیح وسالم رہیں۔)

جس سے باہمی سبّ وشتم (گالی گلوچ)، بدگوئی، درشت کلامی (تلخ کلامی)، طعن و تشنیع (الزامات اور طنزیہ گفتگو) اور استعراء (اشارہ بازی) وسُخریہ (کسی کا مذاق اڑانا) سب ممنوع ٹھہر جاتے ہیں کہ زبان کے یہ کلمات تلوار سے زیادہ کام کرتے ہیں۔

جراحات السّنان له التّیام و لا یلتام ما جرح اللّسان

(تلوار کے زخم بھر جاتے ہیں مگر زبان کے لگے زخم نہیں بھرتے۔)

تمسخرانہ (توہین آمیز) کلمات ہی ہیں، جس سے دنیا میں لڑائی جھگڑے اور فسادات کی بنیادیں قائم ہوکر اُمت میں تفریق و جدال (فرقہ واریت اور جھگڑے) اور نزاع کے جراثیم پرورش پاجاتے ہیں، جس سے امنِ عامہ مختل (خراب) ہو جاتا ہے۔ جسے اسلام نے کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کیا۔

(ج) تمام انسانوں کی جان اور مال کی حفاظت

پھر اس سلم ومسالمت (صلح وموافقت) کا دائرہ مسلمانوں سے آگے بڑھا کر اسے اور وسیع فرمایا گیا، جو غیر مسلموں تک بھی پہنچ جاتا ہے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے:

"المؤمن من اَمنه النّاس علیٰ دمائهم و أموالهم." (5)

(مؤمن وہ ہے کہ تمام لوگ (خواہ مسلم ہوں یا کافر) اپنی جان و مال کے بارے میں اس سے بے خوف اور مطمئن ہوں۔ (کہ نہ وہ ان کا خون بہائے گا، نہ اُن کے مال لوٹے گا، کیوں کہ وہ مؤمن ہے۔)

اَمنه المؤمنون (مسلمانوں کے لیے امن) کے بجائے اَمنه النّاس (تمام لوگوں کے لیے امن) فرمایا گیا، جس میں مسلم و کافر سب داخل ہوجاتے ہیں۔ گویا مؤمن کی

علامت ہی یہ قرار دی گئی کہ دنیا کے لوگ اس سے اپنی جان و مال کے بارے میں مطمئن رہیں اور سمجھ لیں کہ یہ مؤمن ہے۔ نہ ہمارے مال کے بارے میں اس سے خیانت کا خطرہ ہے، نہ جان کے بارے میں کسی تعدی (زیادتی) کا اندیشہ۔

(د) راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا

پھر اسلامی اَمن وسلامتی کا یہ دائرہ صرف اہم اُمورِ جان و مال ہی تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات تک میں وسیع کیا گیا ہے اور کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ جزئی (چیز) بھی جو اَمن وسلامتی میں خلل انداز ہوتی ہو، گوارہ نہیں کی گئی۔

حدیثِ نبویؐ میں ارشاد ہے:

''**الإیمان بضع و سبعون شعبة. فأفضلها قول لا إله إلا اللّٰه. أدناها إماطة الأذیٰ عن الطّریق.**'' (6)

(ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں۔ ان میں افضل شعبہ توحید کی شہادت ہے اور ادنیٰ شعبہ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے۔ (کہ کسی آنے جانے والے کو اذیت نہ پہنچ جائے۔)

گویا راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دیا جانا بھی — جس سے راہ گیر کو اذیت پہنچنے کا احتمال ہو — ایمان کا جزو قرار دیا گیا اور اسے ادنیٰ درجے کا ایمان فرمایا گیا ہے کہ اگر ایک مسلمان کسی تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹا دینے کا جذبہ بھی نہیں رکھتا تو اس میں ایمان ہی نہیں ہے۔ اس لیے ایمان کے معنی ہی اَمن آفرینی (اَمن کی ضمانت) اور مخالف اَمن وسلامتی اُمور سے اجتناب (بچنے) کے نکل آتے ہیں، جو اس کی کھلی دلیل ہے کہ ایمان اپنے جس مادۂ اَمن سے اَمن عام کا پیغام لایا تھا، اس کی ایک ایک فرع (ذیلی دفعہ) اور حقیر سے حقیر فرع (چھوٹے سے چھوٹا ضمنی قاعدہ) بھی نہ صرف اَمن کا پیغام ہے، بلکہ اَمن کا پروگرام ہے۔

(ہ) عوامی مقامات پر گندگی ڈالنے سے بچنا

اسی قبیل سے وہ تمام جزئیات بھی ہیں، جو مخلوق کے لیے سببِ ایذا بن سکتی ہیں اور

ان کی ممانعت صراحتاً (واضح طور پر) حدیثِ نبویہؐ میں ذکر کی گئی ہے، جنھیں اسلام نے برداشت نہیں کیا۔ جیسے لوگوں کی عام نشست گاہ میں بول و براز (پیشاب اور پاخانہ) کردینا وغیرہ، جس سے بیٹھنے والوں کو اذیت ہو کہ انھیں لسانِ نبوت (نبی کی زبان) پر لعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دوری کا مستحق قرار دیا گیا ہے کہ وہ انفسی (اندرونی) طور پر قلوب کی سلامتی میں خلل انداز اور آفاقی طور پر امنِ باہمی میں تفرقہ انداز تھیں۔ جس سے اسلام کا مجموعی حیثیت سے دائمی اَمن وامان ہونا نمایاں ہے۔

(و) امانت کا حکم اور فتنے کی روک تھام

اس موضوع کے سلسلے میں اصولی طور پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ قرآن حکیم کی دو اصطلاحیں ہیں، جو اس میں جگہ جگہ ذکر کی گئی ہیں اور احادیث میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں: ایک ''امانت''، ایک ''فتنہ''۔

امانت تمام اعمالِ برّ (نیکی کے کاموں) وسلامتی کی زمین (بنیاد) ہے، جس سے صلاح ورُشد (نیکی وہدایت) اور اَمن وایمان کا نشو ونما ہوتا ہے، جیسا کہ ابھی واضح ہوچکا ہے۔ ان کی ضد فتنہ ہے، جو تمام اعمالِ بد اور اِثم وعدوان (گناہ وزیادتی) کی زمین (بنیاد) ہے، جس سے کفر وکفریات (حق کا انکار) اور عصیان ومعاصی (نافرمانیاں) اور جدال ونزاع (لڑائی جھگڑا) اُبھرتا ہے۔

اس لیے قرآن حکیم نے اپنی موعظت (نصیحت) وتذکیر (یاد دہانی) سے ایمان و ایمانیات کو تو بار بار سمجھانا چاہا ہے۔ (ارشادِ خداوندی ہے:)

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿55:51﴾

(اور سمجھاتا رہ، کہ سمجھانا ایمان والوں کو کام آتا ہے۔)

تاکہ اَمن وسلامتی پھیلتی پھولتی رہے۔

(ز) فتنہ پروری کی خرابیاں

اور حدیثِ نبویؐ نے فتنے کو سلا دینا چاہا ہے کہ وہ بیدار نہ ہو، تاکہ بداَمنی دبی اور سوتی رہے اور مخلوق ابتلا (آزمائش) سے محفوظ رہے۔ اس لیے (حضورؐ نے) اس کے

جگانے والے پر لعنت فرمائی ہے کہ وہ اَمن عامہ میں خلل ڈال رہا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

''**الفتنة نائمة لعن اللّٰه من أيقظها.**'' (7)

(فتنہ سویا ہوتا ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہو، جس نے اسے جگایا۔)

خواہ یہ فتنہ انگیزی زبان کی حرکت اور قول سے ہو یا عمل اور اعضائے عمل کی کسی حرکت سے ہو، سب اس لعنت کے نیچے آجاتی ہے۔ جیسے استہزا و تمسخر (حقارت سے کسی کا مذاق اڑانا) یا ہمز ولمز (اشارے کنائے سے کسی کی توہین کرنا)، یا غیبت و بدگوئی، یا بہتان طرازی و کذب بیانی اور چغل خوری، یا بدن کی کوئی بھی ہیئتِ کذائی (بدن بولی)، جیسے آنکھ مار دینا، انگوٹھا دکھا دینا، ہاتھ سے تھپڑ کی صورت بنا کر کسی کو اشارہ کرنا، حتیٰ کہ دہشت انگیزی سے کسی کو سہمانا (خوف زدہ کرنا) یا اَمن وسلامتی کی حالت میں کسی کی طرف ہتھیار کا رُخ کر دینا، جو حملہ آوری کے وقت ہوتا ہے وغیرہ، تمام حرکات کی ممانعت کی گئی کہ یہ سب اَمن وسلامتی میں مخل (رکاوٹ) ہیں۔

اس لیے اسلام نے جہاں مثبت پہلو میں امنِ عام قائم کرنا چاہا ہے، جس کی چند اصولی اور فروعی جزئیات پیش کی گئیں، وہیں منفی پہلو سے تمام اسبابِ فتنہ کا ازالہ بھی چاہا ہے، جو قائم شدہ اَمن کے حق میں سم (زہریلا) قاتل ہیں۔ اس لیے اصولی رنگ میں لسانِ نبوت پر عام اعلان کیا گیا:

''**فإن فساد ذات البين، فإنّما هي الحالقة. لا أقول تحلق الشَّعر، و لكن تحلق الدّين.**'' (8)

(لوگوں کے درمیان فتنہ وفساد پھیلانا' (دین کی جڑ) سر سے مونڈنے والا ہے۔ مَیں بالوں کو مونڈنے کا نہیں کہہ رہا، لیکن یہ (فتنہ) تو دین کو ہی کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔)

یعنی جیسے اُسترے سے مونڈنے میں بال کی جڑ تک ختم ہوجاتی ہے کہ ان کی نمود (پرورش) بھی باقی نہیں رہتی، سر کی کھال ہی کھال رہ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات مونڈتے مونڈتے بالآخر ان کا اُگنا بھی بند ہو جاتا ہے، جیسا کہ آخر عمر میں اکثر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی طرح فتنہ، دین کو اس طرح مٹا دیتا ہے کہ اس کی نمود (بڑھوتری) تک باقی

نہیں رہتی اور بالآخر دین کا نشو ونما ہی ختم ہو جاتا ہے۔

(ح) تین دن سے زیادہ باہمی رنجش کی ممانعت

اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام دنیا میں اَمن وسکون کا پیغام ہی نہیں، بلکہ تفصیلی پروگرام بھی لے کر آیا ہے۔ اس لیے قیامِ اَمن کے بارے میں اسلام کا مؤثر حکم یہ ہے کہ اگر دو انسانوں میں رنجش پیدا ہو جائے تو تین دن نہ گزرنے پائیں کہ وہ اپنے قلوب کو صاف کر لیں، ورنہ دو کی رنجش پرورش پاکر بالآخر سو کی رنجش اور انجام کار دو گروہوں کی رنجش بن جائے گی۔ جس سے امنِ عام اور اُمورِ دین میں رخنے پڑ جائیں گے اور قوم کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے، جو اس کے ضعف اور اعداء اللہ (دشمنان خدا) کے غلبے وتقویت کا سبب بنیں گے۔ جس سے پوری قوم کی رفعت ومنزلت ختم ہو جائے گی۔

چو از قومے یکے بے دانشی کرد　　نہ کہہ را منزلت ماند نہ بہہ را

(جب کسی قوم کا ایک آدمی کوئی بے عقلی کا کام کرتا ہے تو نہ بڑے کی عزت رہتی ہے اور نہ ہی کسی چھوٹے کی عزت ہوتی ہے۔)

(ط) امن عالم کے لیے ایک پوری سورت کا نزول

اس لیے قرآن حکیم کو امنِ باہم اور امنِ عالم کا اس حد تک اہتمام ہے کہ اس لفظ (امن کے قیام) کے لیے ایک پوری سورت (سورۂ حجرات) نازل ہوئی، جس میں انھی اسبابِ فتنہ وانتشار کے ازالے کے لیے حکیمانہ تدبیریں فرمائی گئیں۔ ان میں کذب بیانی، افترا پردازی (بہتان)، بلاتحقیق سنی سنائی باتوں پر جذبات سے مغلوب ہو کر تفرقہ، بدظنی، عیب جوئی، تجسس (دوسرے کی بلاوجہ جاسوسی) وتلاش، غیبت طرازی، سُخریہ کاری (ہنسی اڑانا)، چغل خوری، تحقیر وتوہین وغیرہ کی تفصیلات ارشاد فرما کر ان کی حدود کی طرف اشارے فرمائے گئے ہیں، تاکہ کوئی کسی کے لیے ذہنی کوفت، قلبی کدورت (دلی رنجش) اور دماغی تشویش کا ذریعہ نہ بنے، جس سے اسبابِ فتنہ کو پرورش پانے کا موقع مل جائے۔

(ی) اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے دو دائرے

راز اس کا یہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے کسی بھی حقیقی رشتے سے جڑے ہوئے انسانوں

کے مجموعے کو شئے واحد (وحدتِ اجتماعی) اور شخصِ واحد قرار دیا ہے۔ ان سب افراد کو اس مجموعے کا جزو یا جسمِ واحد کے اعضا بتلا کر ان میں اخوت وملنساری قائم فرمائی ہے، تاکہ ان میں ہمدردیٔ باہمی کے جذبات کارفرما ہوں اور اَمن سکونِ باہمی کی جڑیں ان میں جم جائیں۔

اس کے لیے شریعت نے دو رشتوں کو سامنے رکھا ہے:

(الف) ایک مادی رشتہ، جو توالد وتناسل (نسل انسانی کی پیدائش) اور نسل ونسب سے چلتا ہے

(ب) اور ایک روحانی رشتہ، جو نسبت وانتساب اور سند واستناد سے چلتا ہے۔

شریعت میں ان دونوں کے لیے مکمل پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں اجتماعیّتوں کے دو عنوان رکھے گئے ہیں: ایک اخوتِ اسلامی اور ایک انسانی اخوت۔

i۔ اسلامی اجتماعیت کے تقاضے

اخوتِ اسلامی' اسلام کے ماننے والوں میں معتبر ہوگی، جس کا قدرِ مشترک اسلام ہے۔ اس لیے ارشادِ نبوی ہے:

"مثل المؤمنين في توادِّهم، و تراحمهم، وتعاطفهم، مثل الجسد. إذا اشتكىٰ منه عضو فداعى له سائر الجسد بالسّهر والحمّى."(9)

(مؤمنوں کی مثال باہمی محبت و الفت اور رحم دلی میں ایک جسم کی مانند ہے کہ جب جسم کا کوئی حصہ شکایت کرتا ہے تو سارا جسم بخار اور رات کو جاگنے کی وجہ سے تکلیف محسوس کرتا ہے۔)

ظاہر ہے کہ جب سارے مسلمان مثلِ جسمِ واحد کے ہوں گے اور اسلام کے رشتے سے وہ تمام مسلمانوں کو اس جسمِ واحد کے اعضا و اجزا محسوس کریں گے، جو ان سب میں قدرِ مشترک ہوگا تو یہ ممکن نہیں کہ ایک کے دُکھ درد کو دوسرا محسوس نہ کرے۔ خواہ اس مجموعے کا ایک حصہ، یعنی ایک فرد شرق (مشرق) میں ہو اور ایک فرد غرب (مغرب) میں۔ قرآن حکیم نے اس پر اپنے ان اعجازی جملوں سے مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (10:49) (مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔)

جیسے بھائیوں میں خون کا رشتہ مشترک ہوتا ہے، جس سے ایک بھائی دوسرے کا قوتِ بازو بنتا ہے، ایسے ہی تمام مسلمانوں میں اسلام کا رشتہ قدرِ مشترک ہے، جو خون کے

رشتے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور آگے تک جانے والا ہے۔ دنیا تک ختم ہوجانے والا نہیں۔ اور دوسرا رشتہ نسلی اور نسبی ہے، جو دنیا کے کنارے تک ختم ہوجانے والا ہے اور آخرت تک جانے والا نہیں، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ (101:23)

(اُس دن اُن کے درمیان نہ قرابتیں ہوں گی اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے)

اس لیے پہلے رشتے کی بنا (بنیاد) وتحفظ پر پورا زور صرف کیا ہے کہ وہ کسی طرح مضمحل (کمزور) نہ ہونے پائے اور فرمایا کہ اگر ان میں فساد پیدا ہوجائے — جو بدامنی کا واحد ذریعہ ہے — تو سب پر فرض قرار دیا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے کھڑے ہوجائیں۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (10:49)

(سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم پر رحم ہو۔)

جس کا ثمرہ یہ ہے کہ تم رحمتِ حق کے نیچے اس وقت آسکتے ہو کہ اپنے مسلم بھائیوں میں اصلاحِ حال کے لیے ساعی (کوشش کرتے) رہو۔ پر اگر دو مامون (محفوظ) ومطمئن مسلمان افراد یا مسلم جماعتوں میں سوءِ اتفاق (نااتفاقی) سے ہنگامہ آرائی اور قتل وقتال کی نوبت آجائے تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھو، جب تک کہ ان میں مصالحت نہ کرا دو، خواہ اس میں تھوڑی سی بدامنی بھی برداشت کرنی پڑے۔

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (9:49)

(پھر اگر چڑھا چلا جائے ایک (گروہ) ان میں سے دوسرے پر تو تم سب لڑو اس چڑھائی والے سے، یہاں تک کہ لوٹ آئے اللہ کے حکم پر۔ پھر اگر لوٹ آیا تو صلح کرا دو ان دونوں (گروہوں) کے درمیان برابری کے ساتھ اور انصاف کرو۔

بے شک اللہ کو انصاف والے پسند ہیں۔)

ii۔ انسانی اجتماعیت کے تقاضے

ادھر دوسرا رشتہ انسانیت کا ہے، جو تمام بنی آدم کو ایک رسّی سے باندھ کر شئے واحد (وحدتِ اجتماعی) بنا دیتا ہے۔ بشرطیکہ لوگوں کو اس علاقے (تعلق) کا احساس ہو۔ اسی کو حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اللّٰھمّ إنّی أشھد أنّ العباد کُلّھم إخوۃ." (10)

(اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان آپس میں رشتۂ اخوت میں منسلک ہیں۔)

پھر سب کو ایک دوسرے عنوان سے ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا:

"الخلق عیال اللّٰہ، فأحبّ الخلق إلی اللّٰہ من یحسن إلیٰ عیالہ." (11)

(تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ سو اللہ کے نزدیک وہ آدمی سب سے زیادہ محبوب ہے، جو اس کے کنبے کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔)

اس کا حاصل بھی وہی اخوتِ انسانی (انسانی بھائی چارہ) ہے، جب کہ اس کے وجود کی جڑ جو اِن میں قدرِ مشترک ہے، وہ خلق الٰہی (اللہ کا پیدا کرنا) ہے۔ یعنی جب تم سارے انسان ایک اصل سے وابستہ ہو اور وہ وجودِ الٰہی ہے تو سب کے سب ایک اصل کی شاخیں ہو۔ اور ایک شاخ دوسری شاخ کی دشمن نہیں ہوتی کہ اُسے کاٹ پھینکنے کی تگ و دو میں لگی رہے۔

بہرحال یہ رشتہ چوں کہ انسانیت کا رشتہ ہے، اس لیے سارے انسان اس سلسلے سے جُڑ کر جسمِ واحد بن جاتے ہیں، جو جسم کے اعضا و اجزا شمار ہوں گے اور کون سا عضو ہے کہ جو دوسرے عضو کو بے وجہ کاٹ پھینکے گا۔

شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

کہ در آفرینش زِ یک جوہر اند
چو عضوے بہ درد آورد زِ خار
دگر عضو ہا را نماند قرار

(تمام انسان ایک دوسرے کے اعضا کی مانند ہیں کہ یہ اپنی پیدائش میں ایک ہی جوہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کسی ایک عضو کو کانٹا چبھنے سے درد ہوتا ہے تو دوسرے اعضا کو اطمینان وسکون میسر نہیں رہتا۔)

اس سے نہ صرف مسلمانوں ہی کی، بلکہ غیر مسلموں کی ایذا رسانی بھی ممنوع قرار پاجاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی غیر مسلم مظلوم ہے تو مسلمان پر بقدرِ استطاعت اس کی دادرَسی ضروری ہے۔ کوئی دکھ درد میں مبتلا ہو تو بہ قدرِ ہمت اس کی خبر گیری ضروری ہے۔ اور جب تک وہ اسلام کی عداوت اور دشمنی سے باز رہے، اس کی مواسات (دکھ سکھ میں شرکت) ضروری ہے۔ (ارشادِ ربانی ہے):

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ (8:60)

(اللہ تمھیں ان لوگوں سے بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم کو دین کی وجہ سے قتل نہیں کرتے اور تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالتے۔ بے شک اللہ انصاف والوں سے محبت کرتا ہے۔)

اس سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ اسلام عالمی اَمن کا خواہاں اور اسے عالم انسانیت میں جمانے والا ہے۔ کیوں کہ عالمی اَمن عالمی روابط (تعلقات) سے قائم ہوسکتا ہے۔ جو سارے انسانوں کو جوڑے ہوئے ہوں اور ان روابط میں سب سے بڑا ربط ایک اصل کی شاخ ہونے کا ہے، جو انسانیت ہے، لیکن اس (انسانی) ربط اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم اور کُل انسانوں تک اس کا علمی مقام اور روابط کا عالمی نظام اسلام ہی نے برپا کیا ہے۔ چناں چہ ماننے والوں کے لیے اسلامی اخوت کا نظام اور نہ ماننے والوں کے لیے انسانی اخوت کا نظام قائم کیا۔ اس لیے اسی کو حق ہے کہ وہ ان عالمی رشتہ برداروں میں عالمی اَمن کا داعی بنے۔

عالمی امن کے حوالے سے دیگر مذاہب کی حالت

جن مذاہب میں چھوت چھات، نسلی امتیازات اور اونچ نیچ کے جراثیم ہوں گے، وہ عالمی اَمن تو بجائے خود (ایک طرف رہا)، اپنے ماننے والوں میں بھی عمومی اَمن قائم نہیں کرسکتے، کیوں کہ اَمن کا تعلق ربط (اجتماعی رشتے) سے ہے اور ایسا ربط یہاں ایک مذہب کے ماننے والوں میں بھی نہیں ہے تو طبقاتی طور پر اَمن بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ چہ جائے کہ عالمی اَمن نمایاں ہو یا مثلاً جس قوم میں رنگ ونسل کے لحاظ سے (انسانی) حقوق متعین ہوتے ہوں، جو خود تفریق اور اونچ نیچ کی بنیاد ہے، جس کا حاصل قلوب کی ناہمواری اور باہمی فساد کی تیاری ہے تو وہاں ایک ہی ملک کے باشندوں میں قلبی اور قومی اَمن قائم نہیں ہوسکتا۔ چہ جائے کہ وہ عالمی اَمن کا خواب دیکھیں۔ وہ دنیا کے فتنہ خیز حوادث سے گھبرا کر اَمن عالم کے قیام کی فکر کرتے ہیں، لیکن رسمی تنظیموں سے۔ اور ظاہر ہے کہ رسمی علاقے (تعلقات) قلوب میں وحدت قائم کرنے کے بجائے یہ (رسمی) تنظیم ایک مستقل فرقہ اور فرقت (جدائی) کا سبب بن جاتی ہے، جس سے نزاعات (جھگڑوں) کے مزید راستے ہموار ہوجاتے ہیں اور پارٹی در پارٹی سے تفرقہ کی خلیجیں اَور بھی زیادہ وسیع ہوجاتی ہیں۔

اسلام میں امن کی اساس وحدتِ انسانی ہے

لیکن اسلام نے جب کہ مذہب کی لائن میں تعصّبات اور حمیتِ جاہلیت (جاہلانہ غیرت) کو مٹا کر مسلمانوں میں تو اسلام کا رشتہ رکھا اور دوسرے مذاہب کے وہ تمام تفرقہ انگیز علاقے (تعلقات) جیسے رنگ ونسل، وطن وزمین، شخصیات ورجال وغیرہ کاٹ کر انسانی رشتہ رکھا تو قدرتی طور پر اس نے سارے مسلمانوں کو اور پھر سارے انسانوں کو باہم جوڑ دیا اور فرقت مٹا کر ان میں وحدت کا تصور پیدا کیا، جو اَمن کی اساس ہے۔ اس لیے اس کا داعی صرف اسلام ہی کو کہا جاسکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دوسرے مذاہب ان تفریقوں کو باقی رکھ کر اَمن عالم یا قومی اَمن کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔

اس لیے آج وہ مذاہب بھی، جن میں نسلی امتیازات، چھوت چھات اور اونچ نیچ بطور

اصول کے مسلّم (رائج) ہیں، مجبور ہو کر اسلام ہی کے دامن میں پناہ لینے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ اور خود ان اداروں کے حلقوں سے یہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ اگر تم عالمی وقار چاہتے ہو تو نسلی امتیازات ہٹاؤ۔ چھوت چھات چھوڑو اور اونچ نیچ کو خیر باد کہو۔ جیسا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں بھی اپنی آواز بلند کی ہے اور آج (جب یہ خطبہ پیش کیا جا رہا ہے۔) حکومتِ ہند بھی اس سلسلے میں ان تفریقوں کو مٹانے میں ساعی (کوشش کر رہی) ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلام کا معجزہ اور اور اس کا قبول کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ورنہ ان مذاہب میں یہ دعوت کب موجود ہے؟ اس لیے ممکن ہی نہیں کہ غیر اسلام اس کا ذمہ سنبھال سکے۔

اسلام امن کے عالمی فطری اصول کا داعی ہے

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے قابیل و ہابیل کے قصے کے بعد بنی اسرائیل کے سامنے یہ فطری اصول رکھا اور اسی کو اسلام نے اپنا اصول قرار دیا ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (32:5)

(اسی سبب سے بنی اسرائیل پر ہم نے فرض کر دیا کہ جو کوئی بلا وجہ کسی انسان کو قتل کرے یا ملک میں فساد کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ اور جس نے ایک انسان کو زندہ رکھا تو گویا سب لوگوں کو زندہ کر دیا۔)

جس سے صاف واضح ہے کہ اس نے دائرۂ اسلامیت کے ساتھ دائرۂ انسانیت اور علائق انسانیت (انسانی تعلقات) کو بھی مقصدی طور پر پیش نظر رکھا اور ایک انسان کے قتل کو سارے ہی انسانوں کا قتل اور ایک کی بقائے حیات (زندگی کی حفاظت) کو سارے انسانوں کی بقائے حیات (زندگی کی حفاظت) بتلایا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام نے اس کا فطری نظامِ عمل بھی منضبط (مرتب) کر کے پیش کر دیا ہے، جو دوسری کتبِ سماوی میں نہیں ملتا۔ اس لیے عالمی امن کا داعی اور نہ صرف داعی، بلکہ عالمی امن کا دستورِ عمل دینے کا

اصلی سرچشمہ اسلام ہی کو تسلیم کیا جائے گا۔

امنِ عالم اور سیرتِ نبویؐ

غور کیا جائے تو ہر مذہب کا قانون مذہب کے نبی ہی کی سیرت سے بنتا ہے۔ اگر نبی کے قلبِ مبارک میں عالمی دواعی (تقاضے) ہوں تو اس کی تعلیمات اور اس کے ذریعے اُمت میں بھی وہی دواعی پیدا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ اور خصلتِ طاہرہ (پاکیزہ عادات) کو دیکھا جائے تو اسی سے یہ عالمی دواعی اس طرح نکلتے دکھائی دیں گے، جیسے سورج سے کرنیں پھوٹتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فطری طور پر یہ اخلاقِ مودت (محبت بھرے رویے)، ملکاتِ مروّت (دوسروں کی رعایت کی عادت) اور عالمی محبت کے دواعی (تقاضے) عطا فرمائے گئے تھے۔

نبوت ملنے سے پہلے بھی آپؐ ''امین'' تھے

چناں چہ بعثت سے قبل بھی آپؐ کی سیرتِ مبارکہ یہی امنِ باہمی اور اخوت ومودّتِ عامہ (انسانی محبت) سے لبریز تھی اور اسلام کے بعد بھی یہی حقیقت آپ کی تعلیمات سے اُبھری۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعثت سے قبل آپ کے یہ اَخلاق درجۂ اجمال (اختصار) میں تھے اور بعثت کے بعد جب شریعت نازل ہونی شروع ہوگئی تو یہی اَخلاق درجۂ تفصیل میں آگئے اور ان کی حدود و مواقعِ استعمال (استعمال کے موقعے) اور مقدارِ عمل وغیرہ کے دائرے شریعت نے متعین کر دیے۔ چناں چہ قبل از بعثت عرب کے سارے باشندے آپؐ کو ''امین'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ امین کے لفظ میں وہی امنِ عام (عالمی اَمن) موجود ہے، جو لفظِ امین کا مادہ (لفظی ساخت) ہے، جیسا کہ وہ ایمان کا مادہ تھا۔ جس کا حاصل یہ ہے دوست دشمن سب ہی آپؐ کو اَمن والا پکارتے تھے اور اَمن کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ امین شفقت علیٰ الخلق (مخلوق پر شفقت)، کمالِ ایثار اور اتمامِ جود وکرم (پوری مہربانی اور سخاوت) کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے آپؐ پیدائشی طور پر ان اَخلاق وکمالات کا مصدر (سرچشمہ) تھے۔

یہی وجہ ہے کہ آغازِ وحی ہوتے ہی جب کہ آپؐ کو خلعتِ نبوت (نبوت کا لباس) پہنا دیا گیا اور رجالِ غیب (اَن دیکھے لوگوں) سے آپؐ کا سابقہ پڑا تو جبرائیل امین ظاہر ہوئے اور وحیٔ خداوندی آپؐ تک پہنچائی تو آپؐ پر ان غیبی اُمور (غیب کی باتوں) کے انکشاف (کھلنے) سے ایک (فطری) ہیبت اور خوف طاری ہوا۔ آپؐ غارِ حرا سے اس شان سے واپس ہوئے کہ خوف و ہیبت سے کپکپا رہے تھے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا (زوجۂ مطہرہ) سے فرمایا:

"زمّلونی زمّلونی لقد خشیتُ علیٰ نفسی." (12)

(مجھے چادر اوڑھا دو۔ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔)

اور اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جن الفاظ میں آپ کو تسلی دی، وہ یہ تھے:

"کلّا! و اللّٰہ! لا یُخزیکَ اللّٰہ أبداً، إنّک لتصل الرّحم، و تقری الضّیف، و تکسب المعدوم، و تحمل الکلّ، و تُعین علیٰ نوائب الحقّ." (13) (خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رُسوا نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ وسائلِ معاش نہ رکھنے والوں کو کما کر کھلاتے ہیں۔ کمزور لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ قدرتی آفات پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔)

ظاہر ہے کہ یہ وہی اَخلاقِ انسانیت اور ملکاتِ شرافت (شریفانہ عادات) ہیں، جن سے حسنِ معاشرت اور امنِ باہمی اُبھرتی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ بلاتخصیص یگانہ و بیگانہ (جاننے اور نہ جاننے والے) اور بلاتخصیص امیر و غریب، خدمتِ خلق اللہ اور شفقت علی الخلائق (مخلوق پر شفقت) آپؐ کا شعار تھا۔ جس کا حضرت خدیجہؓ اقرار فرما رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ عزیز و اقربا کے لیے صلہ رحمی، وارد و صادر (آنے جانے والے)، امیر و غریب، مفلس و نادار کے لیے جود و عطا (فراخ دلی اور مہربانی)، مجبور و لاچار کے لیے مہمان نوازی، چارہ گری اور قومی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعدی اور آمادگی وغیرہ ہی وہ کریمانہ اَخلاق ہیں، جو اَمن کے لیے جڑ، بنیاد اور بداَمنی کے لیے تیر و نشتر ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ اَمن دوستی اور اَمن پروری اسلام سے قبل کی ہے، جس پر دوست اور دشمن سب کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ جس سے واضح ہے کہ آپ کی فطری سیرت (جسے اسلام نے اُجاگر کیا) یہی عالمی محبت و اَمن اور عالمی اخوت وملنساری تھی۔

حضورؐ کا اعلانِ امن

اُدھر اسلام آنے کے بعد اس کی تکمیل کے اعلان کے موقع پر حجۃ الوداع میں خاص طور سے جو ہدایتیں آپ نے اُمت کو دیں، وہ یہ تھیں:

"انّ العباد کُلّھم إخوۃ." (14) (تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔)

بھائی کے لفظ سے جو محبت و شفقت، موانستِ باہمی (باہمی انس) اور اَمن پروری ٹپکتی ہے، اسے کوئی دوسرا (لفظ) ادا نہیں کرسکتا۔ پھر اسی خطبے میں خصوصیت سے

"اتّقوا اللّٰہ فی النّساء." (15)

(عورتوں کے بارے میں اللہ (کے عذاب) سے ڈرو۔)

فرما کر ضعفا (کمزوروں) کے بارے میں لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے کہ ان کی خدمت و رعایت اور ان پر ترحم و شفقت میں ہرگز کمی نہ ہونی چاہیے، بلکہ ہر مسلمان کا شعار ہونا چاہیے۔

ان ہدایات کا حاصل پھر وہی اَمن و سکونِ باہمی نکل آتا ہے، جس سے خلائق (مخلوق) خدا باہم جڑ جائے اور اس میں فرقہ پسندی کے جذبات باقی نہ رہیں۔ اس لیے اسلام سے قبل بھی آپؐ کی سیرتِ طیبہ سے عالمی اَمن و اخوت، ہمدردی و ایثار اور خدمت خلق اللہ ہی کا دائرہ نکلتا ہے۔ جس نے پورے اسلام کو گھیر رکھا ہے، حتیٰ کہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ عبادات تک ہی محدود نہ تھا۔

امن کے قیام میں اسلامی معاشرت کے اثرات

پس توحید و رسالت کے اقرار کے بعد اسلامی معاشرت کہ جو خالص توجہ الی اللہ کا دائرہ ہے، شفقت علی الخلق (مخلوق پر مہربانی) سے خالی نہیں۔

(الف) نماز میں امن کے تقاضوں کی رعایت

اگر نماز کی صف میں بھی کوئی آگے پیچھے ہوجاتا ہے تو اسے روکا گیا کہ یہ صورتِ اختلاف ہے۔ اس سے بھی بچو:

"لتسوُّنّ صفوفكم أو ليخالفن الله بين وجوهكم." (16)

(تم صفوں کو سیدھی رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے درمیان باہمی اختلاف ڈال دیں گے۔)

پھر سیدھی صفوں سے اگر کوئی اگلی صف میں بڑھنا چاہے، تخطیٔ رقاب (گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنا) چاہتا ہے تو تخطیٔ رقاب (گردنیں پھلانگ کر) جانے کی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ اس سے دوسروں کو اذیت پہنچ کر ان میں کدورت (رنجش) قائم ہوتی ہے، جوامنِ باہم کے بھی خلاف ہے۔ اور اگر پھر بھی بڑھے تو:

"و ليّنوا بأيدى إخوانكم." (17)

(اپنے بھائیوں کے ساتھ نرم رویہ اپناؤ۔)

فرما کر ہدایت دی گئی کہ آگے بیٹھے ہوئے انسان کے کندھے پر ہاتھ بھی رکھو تو اتنی نرمی اور رعایتِ طبع کے ساتھ رکھو کہ گردن والا اس مشفقانہ دست اندازی سے بجائے کدورت (رنجش) کے محبت کا اثر لے اور تمھارا گرویدہ ہو جائے۔ جو اُنس باہمی اور اس سے اَمن باہمی کا ذریعہ ثابت ہو اور آخر کار ختمِ صلوٰۃ (نماز کے اختتام پر) تحیتِ مبارکہ (دُعا) السّلام عليكم و رحمة الله (تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔) کا کلمہ رکھا گیا ہے۔ گویا عالم غیب سے لوٹ کر جب دنیا میں آؤ تو مسلمانوں پر درود وسلامتی، رحمت و برکت ڈالتے ہوئے لوٹو، جو قلوب کے امنِ عام کی کھلی ہوئی ضمانت ہے۔

(ب) حج میں امن کے تقاضوں کی رعایت

حج کی عبادت میں خصوصیت سے:

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ط (197:2) (اور حج میں جھگڑا نہ کرنا۔)

فرما کر نزاعِ باہمی سے بچایا گیا اور یگانگت اور اتحادِ باہمی کی جڑیں دلوں میں پیوست

کی گئی ہیں، تاکہ حج کے ذریعے سے ہی دنیا عالمی اَمن کا پیغام لے کر اپنے گھروں کو لوٹے۔

(ج) جہاد کی روح؛ قیامِ امن

جہاد کی عبادت جنگی عبادت ہے، جو معاندینِ حق (حق کے دشمن) اور فتنہ پروروں سے دفعِ فتنہ (فتنہ کو دور کرنے) کے لیے کی جاتی ہے، (فتنہ) جو امانت اور اَمن کی ضد ہے اور ظاہر ہے کہ فتنے کا دفعیہ ہی اَمن وسلامتی کا حصول ہے۔ اس لیے جہاد کی روح بھی قیامِ اَمن ہی نکلتا ہے۔ گو اس کی صورت بظاہر بداَمنی کی ہے۔

پھر عینِ جہاد میں بھی جب کہ تلوار چل رہی ہو اور سر کٹ کٹ کر گیندوں کی طرح اُچھل کر گر رہے ہوں، ترحم وشفقت سے مجاہدوں کو بیگانہ نہیں بنایا گیا، بلکہ تعلیم یہ ہے کہ بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بچوں کو تہ تیغ نہ کرو۔ عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے رہبانوں (عبادت گزاروں) کو قتل نہ کرو۔ عورتوں پر ہاتھ نہ ڈالو۔ صرف قتال کنندوں (جنگ لڑنے والوں) سے قتال (لڑائی) کرو اور اس میں بھی یہ شفقت آمیز ہدایت ہے کہ کفار کے مقتولین کو مُثلہ (نعش کی بے حرمتی) نہ بناؤ کہ غیظ وغضب میں آکر ان کی آنکھ، ناک، کان کاٹ کر انھیں بے ہیئت (بدصورت) بنا دو کہ یہ قساوتِ قلبی (دل کی سختی)، غیظِ نفسانی (ذاتی غصہ) اور نقصِ باطنی کی دلیل ہوگی، جس کے لیے جہاد وضع (مقرر) نہیں کیا گیا۔ وہ صرف اعلاءِ کلمۃ اللہ (اللہ کا پیغام بلند کرنے) کے لیے ہے، نہ کہ دلوں کے بخارات اور ذاتی جذبات نکالنے کے لیے ہے۔

(د) اجتماعیت کے ہر دائرے میں عالمی امن

غرض! عادت ہو یا عبادت، معاشرت ہو یا معیشت، خلوت ہو یا جلوت، انفرادیت ہو یا اجتماعیت، ہر دائرے میں اسلام نے عالمی اَمن، بین الاقوامی اخوت، بین الاوطانی (وطنوں کے مابین) محبت و مروّت، شفقت و ایثار اور بین المِلّی (ملتوں کے مابین) ہمدردی اور نرم جوئی ہی کا منظر پیش کیا ہے، تاکہ عالم اسلامیت ہی نہیں، بلکہ پورا عالم انسانیت انسانی حیثیت سے باَمن ثابت ہو اور کوئی فرد کسی فرد کے لیے اور کوئی قوم کسی قوم کے لیے درد اور اذیت کا باعث نہ ہو۔ غرض! زندگی کے ہر دائرے اور ہر موڑ سے

بدامنی، انتشار پسندی اور تفرقہ اندازی کی جڑیں اُکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔ یہ سب کچھ اسلام کی مثبت تعلیم کے ثمرات ہیں۔

(ہ) امن کی ضد بے جا تعصب کی ممانعت

اب جہاں تک منفی پہلو کا تعلق ہے، جس سے اقدام میں منافرت اور توحش پیدا ہوکر بدامنی کے جراثیم اُبھرتے ہیں، تو ان کی سب سے گہری جڑ (جاہلی) تعصب (بے جا طرف داری) ہے۔ اسلام نے اس تعصب کا بھی بھرپور استیصال (قلع قمع) کیا ہے۔ اس کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہی یہ ہے کہ حق و باطل کے ردّ و قبول کا معیار اپنائیت وغیریت بن جائے کہ اپنے کی بات واجب القبول (قابل قبول) ہونی چاہیے، خواہ وہ باطل (غلط) ہی ہو اور غیر کی ہر بات واجب الرد (مسترد) مانی جائے، خواہ وہ حق (صحیح) ہی ہو۔ یا ردّ و قبولِ حق کی کسوٹی گروہ بندی ہو جائے کہ اپنے گروپ کی ہر چیز کو مانا جانا ناگزیر ہو۔ خواہ وہ غلط ہی ہو اور دوسرے گروپ کی کوئی بات قابل التفات نہ سمجھی جائے۔ خواہ وہ صحیح ہی ہو کہ یہ خدا پرستی نہیں، بلکہ خود پرستی ہے۔ حق پسندی نہیں، بلکہ باطل پرستی ہے یا تعزیرات اور حدود کے اجرا (جاری کرنے) سے بااقتدار طبقہ مستثنیٰ رہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم ہو اور بے کس اور بے سہارا طبقہ ہی ان کے اجرا کا مستحق ہو۔ خواہ وہ بے قصور ہی ہو۔ ظاہر ہے کہ انسانوں میں اس ظالمانہ تفریق کی بنیاد عصبیت (بے جا جانب داری) اور حمیتِ جاہلیت (جاہلانہ غیرت) کے سوا دوسری نہیں، جو مختلف راستوں سے انسانی وحدت اور اس عالمی بھائی چارے میں دخیل ہوکر اسے پارہ پارہ کر ڈالنا ہے۔ اس لیے اسلام نے سب سے پہلے اسی جاہلی تعصب (اپنوں کی بے جا حمایت) کا خاتمہ کیا ہے، تاکہ بدامنی اور تفرقۂ باہمی کا یہ عفریت بنی نوعِ انسان کی زندگی کے ہر ہر گوشے سے نکل جائے اور اس میں خالص حق پسندی کارفرما ہو۔ خواہ وہ غیر ہی کے حق میں جاتی ہو:

وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ (135:4)

(اگرچہ تمھارا یا تمھارے ماں باپ اور قرابت والوں کا نقصان ہو۔)

(و) عدل اور قانونی مساوات؛ وحدتِ انسانیت اور امن کا نور

بہرحال عدل وانصاف اور قانون کی مساوات اور حُبِّ انسانیت کو اصل قرار دیا ہے کہ اسی میں وحدتِ انسانیت اور اَمن وسلامتی کا نور چھپا ہوا ہے۔ اور تعصب اس کے لیے زہر ہلاہل (قاتل زہر) کی حیثیت رکھتا ہے، یہ رویہ کبھی بھی انسانوں کو شیر وشکر نہیں بننے دے سکتا۔ اس لیے اسلام نے اس کی جڑیں نکال کر پھینک دی ہیں۔

(ز) بے جا تعصب کے کئی پہلو اور اُن کی نفی

i۔ شخصی عقیدت پر مبنی بے جا تعصب کی ممانعت

یہ تعصب کبھی مؤثر شخصیتوں اور مقتداؤں (رہنماؤں) کی غیر معمولی عقیدت ومحبت کے نام پر سر اُبھارتا ہے کہ غلوِ محبت (محبت کی شدت) سے اپنے مقتداؤں (رہنماؤں) کی بے حد توقیر وتعلیم کے راستے سے دوسری اقوام کے مقتداؤں کی تحقیر وتوہین کی جائے اور اس طرح فرقہ وارانہ فسادات اور گروہ بندیاں بنی نوعِ انسان میں پھوٹ پڑیں۔ جس سے عالمِ انسانیت کا امنِ عام رُوبہ زوال ہوجائے اور دنیا کی ساری قومیں باہمی بے چینی، باہمی بے اعتمادی اور باہمی کشمکش کا شکار ہوکر رہ جائیں۔

اس لیے اسلام نے ایمان بالرسول کی تلقین کے ساتھ دوسرے انبیا علیہم السلام کی نہ صرف تعظیم ہی ضروری قرار دی، بلکہ ان پر ایمان لانا اسی طرح فرض قرار دیا، جتنا اپنے برگزیدہ پیغمبر پر ایمان لانا فرض بتایا۔ ارشادِ ربانی ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (136:2)

(تم کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اترا ہم پر اور جو اترا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ علیہم السلام کو اور جو ملا دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں

کرتے ان سب میں سے ایک میں بھی اور ہم اس پروردگار کے فرماں برادر ہیں۔)

یہ نہ صرف بین الاقوامی تفرقہ مٹانے کی دلیل ہے، بلکہ عالمی اَمن اور بین الاقوامی بھائی چارے کی بھی ایک زبردست شہادت ہے۔ اس لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"لا ینبغی أن یقول أنا خیر من یونس بن مِتّیٰ." (18)

(یہ مناسب نہیں ہے کہ کہا جائے کہ میں یونس بن متی سے زیادہ بہتر ہوں۔)

جس کا مقصد حضرت خاتم الانبیا کی افضلیت کی نفی نہیں، بلکہ یونس علیہ السلام کی تحقیر یا توہین کی نفی کی تعلیم ہے۔

ii۔ وطنی محبت پر مبنی بے جا تعصب کی ممانعت

کبھی یہ تعصب وطنوں کے راستے سے رہزنی کرتا ہے کہ اپنے وطن کی برتری اس طرح سے کی جائے کہ دوسرے وطنوں کی کم تری اور تقبیح (برائی) نمایاں ہونے لگے۔ تو قدرتی بات ہے کہ دوسرے وطن والا اس سے دل گرفتہ ہو کر اس مدّاحِ وطن کی مزاحمت کے درپے ہوگا، جس سے وطنی تعصّبات اور مذہبی غیر مذہبی، ایشین، یورپین، افریقن، امریکن کے فرق سے ہر ایک اپنے وطن کی تحقیر و تذلیل کے ردّعمل میں ایک دوسرے کے درپے ہوں گے اور باہمی کشمکش کا اثر پھر وہی وحدتِ انسانیت پر پڑے گا اور فرقت (انسانوں کے درمیان فرقہ واریت) کے جذبات اُبھر آئیں گے۔ اور اس طرح وحدتِ انسانی' وطن کے نام پر پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اس لیے اسلام نے اس تعصب کی بھی بیخ کنی کی اور دنیا کے سارے وطنوں کی واجبی خوبیاں دنیا کے سامنے رکھ دیں۔

چناں چہ **کنز العُمّال** اور دوسری کتبِ حدیث میں ایک سے کہیں زائد روایتیں دنیا کے معروف ممالک ہند، یمن، مصر، شام، عراق، فلسطین، حجاز، فارس، لنکا وغیرہ کے مناقب (خوبیوں) و اوصاف میں موجود ہیں، جس کی وجہ یہ نہیں کہ وطنوں میں تفاضل (ایک دوسرے پر فضیلت) نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ایک انسانیت پسند شخص ہر وطن کو اپنا وطن سمجھے۔ جیسا کہ خود اسلام نے اپنا کوئی خاص وطن متعین نہیں کیا۔ وہ عالم گیر دین ہے اور ہر وطن کے لیے یکساں پیغام ہے، بلکہ اس کا طریقِ تعلیم یہ ہے کہ ؎

ہر ملک ملکِ ما ست کہ ملکِ خدائے ما ست
(ہر وطن ہمارا وطن ہے کہ ہمارے خدا کا بنایا ہوا ہے۔)

اس لیے ایک مسلم کا تصور بھی یہی ہونا چاہیے، جو ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا ، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس لیے لسانِ نبوت (نبیؐ کی زبان) پر صاف اعلان کرایا گیا:

''ألا! لا فضل لعربی علیٰ عجمی إلّا بالتّقویٰ.'' (19)

(سن لو! ایک عربی کو غیرعربی پر کوئی فضیلت نہیں بلکہ فضیلت کی چیز دین اور تقویٰ ہے۔)

iii۔قومی محبت پر مبنی بے جا تعصب کی ممانعت

کبھی یہی تعصب قومیت کے راستے سے اُبھرتا ہے کہ ایک قوم اپنی برتری کے جذبے سے دوسری اقوام کی تحقیر و تذلیل کو اپنا وظیفہ قرار دے لے۔ جس سے اقوام میں پھوٹ پڑتی ہے اور وحدتِ انسانی پارہ پارہ ہوجاتی ہے۔ اس لیے لسانِ نبوت پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ اسلام قومیتوں کے (درمیان باہم نفرت کے) جذبات اُبھارنے کے لیے نہیں آیا، جب کہ وہ ہر قوم کی ہدایت و دوستی کا یکساں پیغام لے کر آیا ہے۔ اس لیے ہر قوم اس کی نگاہ میں یکساں ہے۔ چناں چہ لسانِ نبوت پر یہ اعلان فرمایا۔

پھر قرآن نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (158:7)

(آپ ﷺ کہیے، اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف۔)

پس اس آیت اور اس روایت میں ''النّاس'' کا لفظ لا کر قوم اور قوم کی بجائے عالَم انسانیت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جس کے ہوتے ہوئے محدود قومیتوں کا تصور ہی نہیں اُبھر سکتا کہ جس سے قومی (حوالے سے بے جا) تعصب کو راہ ملے اور اس قومی تبدیلی سے تفرقۂ باہمی کے جراثیم پیدا کر کے عالم اَمن میں خلل انداز ہوں۔

iv۔ رنگت کے اختلاف کی بنیاد پر بے جا تعصب کی نفی

کبھی کبھی تعصب رنگ و لون (مثلاً کالے گورے کی تمیز) کے راستے سے برتری اور کہتری (کمتری) کی بنیاد استوار کرتا ہے اور کالے گورے کی تفریق سے باہمی تحقیر و تذلیل اور فرقت کی بیماری انسانوں میں پھیل کر وحدت و یگانگتِ انسانی کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالتی ہے، جو آج یورپ کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی ہے۔

لیکن اسلام چوں کہ کالے گورے کی تفریق مٹا کر سب کے لیے یکساں وحدتِ باہمی اور باہمی میل جول لے کر آیا ہے اور منافرت کی جڑیں اس نے اُکھاڑ پھینکی ہیں، اس لیے اس رنگ و لون کے تعصب کی بیخ کنی (بنیاد ختم کرنے) کے لیے لسانِ نبوت پر اعلان فرما دیا گیا:

"بُعثتُ إلٰی کُلّ أحمر و أسود." (20)

(میں سرخ و سیاہ (گویا ہر رنگ کے) انسان کی طرف بھیجا گیا ہوں۔)

تاکہ کسی مسلم میں بہ حیثیت مسلمان ہونے کے رنگ و لون (Color) کے فرق کا مصداق ہی باقی نہ رہے اور یہ برتری و کہتری (کمتری) کی عمارت اپنی جڑوں سمیت اُکھڑ کر پارہ پارہ ہوجائے، جس سے عالمی وحدت اور عالمی اَمن وسکون کو جگہ ملے۔

چناں چہ اسلام کی تاریخ بھی یہی ہے کہ اس کے دائرے میں جو جو قدر و منزلت حضرت صہیبؓ رومی جیسے سرخ و سپید انسان کی تھی، وہی قدر و منزلت حضرت بلال حبشیؓ جیسے سیاہ رنگ کے انسان کی بھی تھی اور بڑے بڑے صحابہؓ (جیسے حضرت عمر فاروقؓ) انھیں سیّدنا و مولانا (ہمارے سردار، ہمارے آقا) کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

v۔ نسل اور نسب کی بنیاد پر بے جا تعصب کی نفی

کبھی یہی تعصب، نسل اور نسب کی راہ سے داخل ہو کر باہمی تحقیر و تذلیل کا راستہ ہموار کرتا ہے اور انسانوں میں آویزش (چپقلش) بڑھ کر انسانی فرقت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ جیسا کہ عرب جاہلیت میں کہتری (کمتری) اور برتری کا معیار یہی نسلی امتیازات

بنے ہوئے تھے۔ اور اس کی بنا پر رات دن ان کی باہمی جنگوں سے قوم، ہلاکت کے کنارے آ لگی تھی تو اسلام نے اس کی بھی بیخ کنی کر دی (جڑ اُکھاڑ دی) اور لسانِ نبوت پر اعلان فرما دیا گیا:

"النّاس بنو آدم و آدم من تُراب." (21)

(تمام لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔)

جس سے اخوتِ باہمی کے جذبات اُبھرے۔ یہی نہیں، بلکہ یہ بھی بتلا دیا گیا کہ تمھارا جوہرِ خلقت (پیدائش کا مادہ) بھی ایک ہی ہے اور وہ مٹی ہے۔ سوتم خاکی الاصل (اصل میں مٹی سے بنے) ہو۔ نہ کوئی جواہرات سے بنا، نہ سونے چاندی سے، نہ کوئی ظلمت اور نہ کوئی نور سے بنا ہے۔ نہ کوئی چاند سورج کی اولاد ہے، نہ آسمانی جوہر سے تولا ہوا ہے۔ نہ کوئی ملائکہ (فرشتوں) کی اولاد ہے۔ اس لیے بہ لحاظِ نسب ونسل اور بہ لحاظِ جوہرِ خلقت (پیدائشی جوہر) تم میں سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

انسانوں میں فرقِ مراتب اَخلاق وکردار کے سبب ہے

البتہ اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انسانوں میں تفاضل (ایک دوسرے پر فضیلت)، فرقِ مراتب (مرتبے کا فرق) اور بڑائی چھوٹائی بھی موجود ہے، جو فطری بھی ہے اور مشاہداتی بھی، بلکہ فساد زدہ انسان اسی کو سامنے رکھ کر برتری اور کہتری اور فرقت کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

اس لیے اسلام نے اسے باقی رکھ کر اس کا معیار وہ قائم کیا ہے، جو کسی بھی ہوش مند انسان کے لیے باعثِ تفریق نہیں بن سکتا اور وہ اس کے نزدیک شخصیتوں کے جذباتی عقیدت ومحبت نہیں، بلکہ شخصیتوں کا دین وتقویٰ (حسن کردار) اور فضل وکمال ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ انسانوں کی اونچ نیچ غیر اختیاری یا خلقی نہیں کہ پیدائشی طور پر کوئی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بڑائی اور برتری کے لیے مختص کر دی گئی ہو اور کوئی ہمیشہ کے لیے پستی، حقارت وکہتری کے لیے منتخب ہو چکی ہو، بلکہ ان کی اونچ نیچ ان کی اختیاری ہے کہ جو بڑا بننا چاہے، بڑا بن جائے اور جو حقیر رہنا چاہے، حقیر رہ جائے۔ اور جو فضل وکمال

والا ہے، ظاہر ہے کہ دنیا اس کی بڑائی کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی اور جو خود ہی حقیر و کم تر رہنا چاہے تو دنیا اسے کم تر ہی سمجھنے پر مجبور ہوگی اور کسی کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا۔

پس جو لوگ تقویٰ، طہارت، بے لوثی و بے غرضی اور غنا و استغنا (خودداری)، یعنی علمی، اَخلاقی اور عملی کمالات سے مزین ہوں گے تو وہ فطری طور پر سب کے پسندیدہ اور محبوب بنیں گے، ورنہ نیچے دب کر رہ جائیں گے۔ اس صورت میں خلقی (پیدائشی) اونچ نیچ کا کوئی تصور باقی نہیں رہ سکتا کہ دنیا اس کے ذریعے سے فساد پھیلائے اور وحدتِ انسانی میں خلل انداز ہو۔

یہ فرقِ مراتب نہ ہی کسی خاص انسانی طبقے یا وطن اور علاقے تک محدود رہ سکتا ہے، نہ کسی قوم کو عقلاً اور فطرتاً اس پر اعتراض ہوسکتا ہے۔ چناں چہ دنیا کی ہر قوم، ہر وطن اور ہر ہر رنگ میں ایسی باکمال اور نیک شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، جن کی تعظیم و تکریم کو ہر قوم اور ہر وطن نے اپنا فخر سمجھا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ ذریعہ تفریق بنیں، ذریعۂ اتحاد ثابت ہوئے ہیں۔ اور جو بھی ان سے وابستہ ہوگیا، وہ نہ صرف ایک مرکز سے جڑ کر خود ہی مرکزِ متابعت (قابل اتباع) بنا، بلکہ مخلوق کے دائروں کی حرکت بھی اس کے تابع ہوگئی۔

جس کے نتیجے میں مخلوق بھی اس کی خیر خواہ اور خیر طلب ہوگئی اور وہ مخلوق کا خیر جو (بھلائی چاہنے والا) ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں فرقت وتفریق کے جذبات تو کیا اُبھرتے اور محبت و داد کے دواعی پیدا ہوئے، جس سے عالم کو سکون و اَمن ملا۔

پس اسلام کے نزدیک معیارِ فوقیت وکم تری، کسبِ کمال (کمال حاصل کرنا) ہے، نہ کہ خلقی جمال (پیدائشی خوبصورتی)، انفاقِ دولت و مال ہے، نہ کہ حریصانہ جمعِ اموال (حرص و ہوس کے ذریعہ مال جمع کرنا)، قربِ ملک متعال (بلند و بالا بادشاہ ذات خداوندی) ہے، نہ کہ قرابتی اتصال (رشتہ کی قربت)۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست
(ملا عبدالرحمٰن جامی کا شعر ہے)

(جامی! عشق خداوندی کا بندہ ہوجا اور نسب ونسل کو چھوڑ کہ اس راہ میں

فلاں کا بیٹا ہونا کوئی چیز نہیں ہے۔)

vi۔ ظالم حکمرانوں کے طبقاتی تعصب کی ممانعت

کبھی کبھی تعصب وتفرق (گروہی تصور) ریاست (سرداری) اور جاہ واقتدار کے معیار سے ابھرتا ہے، جس سے امرا (حکام) اپنے مامور (محکوم) کو اپنی ذاتی ملک (ملکیت) سمجھ لیتے ہیں اور ان پر اپنے کو خدائی اختیارات کا حق دار سمجھ کر بے جا تعدی (بلا وجہ زیادتی) اور ظلم وستم کو اپنا جائز حق جاننے لگتے ہیں، جس سے باہمی منافرت اور بیزاری کے دروازے کھل کر قوم کے طبقات میں وہی منافرت نشو ونما پاجاتی ہے، جو بالآخر تفرقہ اور تفرق کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ سازشیں اُبھرتی ہیں، قتل و غارت ہوتا ہے، جس سے ایک قوم ہی نہیں، بلکہ دنیا کی تمام اقوام متاثر ہوتی ہیں اور انسانی نسل کی وحدت پارہ پارہ ہوکر بداَمنی کے لیے راستہ ہموار کردیتی ہے۔

آج یا آج سے قبل ملکوں میں بغاوتیں اسی غلط معیار کا ثمرۂ قبیحہ (بُرا نتیجہ) ہیں، جس سے پورا ملک بداَمنی کا لقمۂ تر بنا اور بنتا رہا ہے۔ اس لیے اسلام نے اس امیر و مامور (حاکم ومحکوم) کے تعصب کی بھی بیخ کنی کی اور اعلان کیا کہ امیر وحکمراں قوم کا نگہبان، مربی اور بہ منزلۂ باپ کے ہے، نہ کہ بہ منزلۂ جبار (جبر وستم کرنے والا) اور مطلق العنان (آمر)، خودمختار کے ہے۔ وہ صرف قانونِ الٰہی کا متبع (تابع) اور منفذ (نافذ کرنے والا) ہے، نہ کہ ذاتی حکمرانی کا مجاز۔

انبیا علیہم السلام بھی قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے والے ہوتے ہیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو بلاشبہ افضل البشر، اکمل الخلائق اور سید ولدِ آدم (اولادِ آدم کے سردار) ہیں، لسانِ خداوندی پر اعلان فرمایا گیا:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (110:18)

(آپ کہیے میں بھی تم جیسا ایک آدمی ہوں۔ میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود ایک اللہ ہی ہے۔)

اور خود ذاتِ اقدس سے کہلوایا گیا:

اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۝ (15:10)

(اگر میں اپنے پروردگار کا حکم نہ مانوں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔)

کہیں فرمایا گیا:

قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ (15:10)

(آپ کہہ دیجئے میرا کام نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس (قرآن حکیم) کو بدل ڈالوں۔ میں تو تابعداری کرتا ہوں اس کی جو میری طرف حکم آئے۔)

پھر تمام انبیائے کرام کے بارے میں فرمایا گیا:

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۟ فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ ۪ وَاَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ؕ وَمَا اخۡتَلَفَ فِیۡہِ اِلَّا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡہُ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ۚ فَہَدَی اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ مِنَ الۡحَقِّ (213:2)

(سب لوگ ایک دین پر تھے پھر (ان میں تفرقہ پڑ گیا تو) اللہ نے پیغمبر بھیجے خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے۔ اور اتاری ان کے ساتھ سچی کتاب کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں۔ اور کتاب میں جھگڑا تو اِنھیں لوگوں نے ڈالا جن کو کتاب ملی تھی۔ اس کے بعد کہ پہنچ چکے ان کو صاف حکم آپس کی ضد سے۔ پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو اس سچ بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے۔)

جس سے واضح ہے کہ ان سادات بنی آدم (انسانوں کے سردار) انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی مخلوق کا مالک ومختار نہیں بنایا گیا، بلکہ انا بشر (میں بشر ہوں) اور مثلکم (تم جیسا ہوں) کہہ کر ان میں اور اُمم (اقوام) میں قانونِ حق کے معیار سے مساوات قائم کی گئی ہے۔ وحیٔ الٰہی اور تربیت خلق اللہ (اللہ کی مخلوق کی تربیت کے حوالے سے) عظمت اور بڑائی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ جو بلاشبہ سلیم قلوب (کجی سے پاک دلوں) کو ان

(انبیائے کرامؑ) کے آگے جھکائے رکھتی ہے۔لیکن جہاں تک بشری معاملات کا تعلق ہے، انھیں ذاتی احکام دینے کے بجائے قانونِ الٰہی کے نفاذ اور اتباع کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس قانونِ الٰہی میں تغیر وتبدل (تبدیلی) کا بھی انھیں کوئی اختیار نہیں دیا گیا، بلکہ صرف اتباعِ اوامر (احکامات کی پیروی) کا امر (حکم) کیا گیا ہے۔ نیز لوگوں کے باہم اختلافات میں انھیں فیصلہ حق کا پابند بنایا گیا ہے۔ ذاتی دباؤ کا مجاز نہیں بنایا گیا۔ دین تک میں اِکراہ و اِجبار (جبر وتسلط) کی اجازت نہیں دی گئی، چہ جائے کہ تدابیر دنیا میں وہ اس (جبر وتسلط) کے مجاز ہوتے۔

پھر ساتھ ہی آیاتِ بالا میں اس پر بھی مطلع کردیا گیا ہے کہ لوگوں کے یہ نزاعی اختلافات خود ان کے اپنے جذباتِ نفس، دلی بغاوت اور قانونِ الٰہی سے انحراف یا ناواقفیت یا اس کی بے عظمتی اور اس سے بے تعلقی کا نتیجہ ہیں۔ خود قانون کا یہ اثر نہیں۔ اس لیے قانونِ حق کا منشا وہی وحدتِ عالمِ انسانیت نکلتی ہے، نہ کہ فرقتِ باہمی (آپس کی جدائی) یا بدامنی۔ بلکہ انبیا کے فیصلہ حق سے ہی یہ تمام نزاعات رفع (دور) ہو سکتے ہیں اور اسی سے امنِ باہمی قائم ہوکر اَنفسی (داخلی) اور آفاقی (بین الاقوامی) بدامنی ختم ہوسکتی ہے۔ جس سے صاف واضح ہے کہ انبیائے کرامؑ کی بعثت کا ایک عظیم ترین مقصد عالمِ انسانیت میں قیامِ اَمن ہے، جس پر انسانوں کی تمام صلاح و فلاح، بلکہ تمام عبادات و قربات (اللہ کی قربت کے اعمال) کا دارومدار ہے۔

حکمرانی کی بنیاد خلافتِ ربانی ہے، نہ کہ آمریت

دیکھا جائے تو شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام خلافت ہے کہ تنفیذِ بشری (انسانی بنیادوں پر نفاذ) ہو اور قانون خدائی ہو، جس سے ملوکیت (شخصی آمریت) ختم ہوجاتی ہے، جو کہ دنیا میں فسادات کی اصل ہے۔ کیوں کہ ملوکیت کا طبعی مزاج ہی فساد انگیزی، گروہ سازی اور بقائے اقتدار کے لیے پارٹی فیلنگ (منفی گروہی احساسات) ہے:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ

يَفْعَلُوْنَ ۝ (34:27)

(بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو خراب کر دیتے ہیں اس کو اور وہاں کے عزت داروں کو بے عزت کر ڈالتے ہیں اور ایسا ہی کچھ وہ کریں گے۔)

اس کے برخلاف نبوت اور خلافتِ ربانی کا ذاتی اقتدار سے گریز اور اقتدارِ الٰہی کا استحضار (شعوری احساس) ہے۔ تفریق بین الناس (لوگوں کے درمیان فرقہ واریت) سے کُلّی اجتناب (مکمل پرہیز) اور وحدتِ بنی نوع (انسان) کا احیا ہے۔

حکمرانوں کو منصبی فوقیت ہوتی ہے، نہ کہ ذاتی بالادستی

ان قرآنی حقائق سے صاف واضح ہے کہ کسی بھی حکمراں کو کوئی ذاتی تفوق (برتری) نہیں دیا گیا کہ وہ رعایا کے انسانوں کو حقیر سمجھ کر ان پر ذاتی اور نفسانی احکام و جذبات کا تفوق جتانے لگے یا انھیں اپنے سے کم تر جانے، صرف منصبی فوقیت دی گئی ہے، جو تنفیذِ احکام (احکام نافذ کرنے) کی ضرورت سے ہے، نہ کہ استبدادی فوقیت (من مانی بالادستی)، جو فرقت انگیز (تفریق پیدا کرنے کا سبب) ہے۔

ظاہر ہے کہ اس میں سے راعی (حکمران) اور رعایا (عوام) کی اس اُونچ نیچ کی بیخ کنی ہو جاتی ہے، جو جاہل حکمرانوں کے غرورِ نفس سے اُبھر کر ملک میں باہمی منافرت اور باہمی عداوتوں کی تخم ریزی (بیج بونے کا کام) کرتی ہے اور انجامِ کار پورے ملک میں بدامنی، مفسدہ پردازی (تباہی)، جبر و تعدی (ظلم و زیادتی) اور مکارانہ داؤ پیچ کی راہیں ہموار کر دیتی ہیں۔

vii۔ سماجی طبقاتی تعصب کی ممانعت

کبھی یہی تعصب آقا و غلام کے سیاسی و سماجی فرق کی راہوں سے داخل ہو کر اسے ذاتی فرق اور ذاتی اونچ نیچ بنا دیتا ہے، جس سے آقاؤں کا طبقہ اپنے کو خدائی اختیارات و تفرقات کا حق دار تصور کرنے لگتا ہے۔ ایک آقا کی نگاہ میں غلام سے ذلیل چیز دوسری نہیں ہوتی۔ غلام کا اس کے برابر بیٹھنا یا اس کے ساتھ مواکلت و مشاربت (کھانا پینا) تو بجائے خود (الگ بات) ہے، اسے سامنے آ کر عام لوگوں کی طرح سلام و کلام کا حق بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھیڑ بکری اور بیلوں کی طرح ہمہ وقتی بے کسی کی زندگی گزارتا ہے۔ حتیٰ کہ

غلام کی معمولی سی فروگزاشت (بھول چوک) ان کے لیے اَن گنت کوڑوں کی سزائیں، قید و بند کی پاداش، محض آقا کے ایک جذباتی اشارے پر اس کی جان تک لی جاسکتی تھی۔ اور بعض اوقات آقاؤں کی محض تفریحِ طبع کے لیے انھیں شکنجوں میں بھینچ کر ختم تک کردیا جانا معمولی بات تھی، جو آقاؤں کے لیے تفریحی قہقہے بلند کیے جانے کا سامان ہوتی تھی، جس سے غلاموں کی زندگی اجیرن (مشکل) ہو جاتی تھی اور وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح اس آقا کی آقائی کو ملیامیٹ کیا جائے۔

بہرحال سید وعبد (آقا وغلام) کی بھی وہ اونچ نیچ تھی، جس سے اوّلاً قلوب کی بے چینی اور انفسی (داخلی) بدامنی نشوونما پاتی تھی اور پھر وہی اُبھر کر آخرکار آفاقی (بین الاقوامی) بدامنی کی شکل اختیار کر لیتی تھی، جس سے دو محارب (لڑنے والے) طبقے پیدا ہوجاتے ہیں اور اس غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لیے سازشیں، ہنگامے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوجاتا تھا اور پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آکر بدامنی اور بے چینی کا شکار ہوجاتی تھی، جیسا کہ آج (بیسویں صدی) کے دور میں روس کا انقلاب اس (بے چینی) کا شاہدِ عدل ہے۔ حتیٰ کہ ساری دنیا ہی آج اس اونچ نیچ سے اس معیار سے مزدور اور سرمایہ دار کی دو پارٹیوں میں بٹ چکی ہے اور اس کے لیے مستقل فلسفہ اور اِزم تیار ہو چکے ہیں، جس سے دنیا میں جنگیں اُبھرتی رہتی ہیں۔

اسلام نے اس کے بالمقابل جہاں سیاسی مصالح (معروضی تقاضوں) سے کسی حد تک غلامی کو باقی بھی رکھا تو ساتھ ہی اس حد سے گزری ہوئی آقائیت کو جو ظلم وستم کا لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھی، کو مٹا کر غلاموں کے وہ حقوق بھی تسلیم کیے، جس سے آقاؤں کی مطلق العنانی (آمریت) ختم ہوگئی اور غلاموں کی ذلتِ نفس جاتی رہی اور اس دائرے کی زندگی میں حقیقی اَمن وسکون قائم ہوگیا۔

چناں چہ جہاں تک معاشرت کا تعلق ہے، آقاؤں کو ہدایت کی گئی کہ غلاموں کو وہی کھلاؤ پلاؤ، جو تم کھاتے ہو۔ وہی پہناؤ، جو تم پہنتے ہو۔ انھیں اسی طرح تعلیم دلاؤ، جیسے اپنے بچوں کو دلاتے ہو۔ گویا غلاموں کو مثل اپنی اولاد کے سمجھو۔ تاکہ انھیں احساسِ کمتری اور دل شکستگی پیدا نہ ہو۔ اور (حضورؐ نے) فرمایا:

"اخوانکم خولکم." [22] (یہ غلام تمھارے بھائی ہیں۔)

یعنی آقاؤں اور غلاموں کو بھائی بھائی بنادیا، تاکہ معاشرت سے اس رواجی آقائی اور غلامی کی برتری اور کہتری (کمتری) کا خاتمہ ہو۔ جو اُونچ نیچ اور چھوت چھات کا سبب بن کر صنفی (نسلی) فسادات اور بدامنی کو جنم دیتی رہی ہے۔ جس سے صاف واضح ہے کہ یہ آقائی اور غلامی ایک وصفی (وقتی پہچان) اور عارضی اور سیاسی (معروضی) نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ انسان کی کوئی اصلی اور جبلی خلقت نہیں ہے، جو زائل نہ ہوسکے۔ اس لیے غلاموں کو آزاد کرنے کے بیسیوں فضائل بیان فرمائے گئے، جو تحریر رقبہ (غلاموں کو آزاد کرنے) سے حاصل ہوسکتے ہیں اور غلامی کا عارضی وصف ہمیشہ کے لیے غلاموں سے زائل ہوجاتا ہے۔

چناں چہ غلامی اگر عورت میں ہے، اسے تعلیم دے کر اور شائستہ بنا کر آزاد کردینے اور پھر اس سے نکاح کرلینے پر دُگنا اجر کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اگر مرد میں (غلامی) ہے تو اسے مکاتب (معاہدے کے مطابق معاوضہ ادا کرنے والا) بنا کر اسے بدلِ کتابت (غلامی کی قیمت) ادا کرنے کا موقع دیا گیا ہے، تاکہ وہ آزاد ہوجائے اور آقا کے لیے موجبِ اجر و سعادت بنے۔ اس کے علاوہ اور متعدد طریقے اور محرکات، تحریرِ رقبہ (غلاموں کو آزاد کرنے) کے شریعت نے واشگاف (بیان) فرما دیے ہیں، تاکہ یہ عارضی وصف غلامی، غلام سے زائل ہوتا رہے، اور اس کا اصل وصف عود (لوٹ) کر آئے، جو حریت اور آزادی ہے۔

بہرحال اسلام نے انسانی احترام اور انسانی حقوق میں آقاؤں کے ساتھ غلاموں کو بھی شریک رکھا ہے۔ چناں چہ غلام عبادت و طاعت میں آقا کے برابر ہے۔ صفِ صلوٰۃ (نماز کی صف) میں اسے آقا کے دوش بدوش (کندھے سے کندھا ملا کر) کھڑے ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ فضل و کمال اور علم میں ترقی کرکے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے تو اس کے حق کو کوئی زائل نہیں کرسکتا۔ حتیٰ کہ اسلام میں ہزار ہا ہزار علما و مشائخ (حتی کہ حکمران) غلاموں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، جیسا کہ تاریخ شاہد ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا منشا وہی انسانیت کا احترام اور اسے تذلیل و تحقیر سے نکال کر اخوت و محبت اور امن و سکون کے میدان میں لے آنا ہے، جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔ اس لیے اسلام

نے ہر آقائی اور غلامی کے تعصّبات کی بیخ کنی کر کے اسے بھی ذریعۂ اَمن وسکون بنا دیا ہے۔

viii۔عورت پر بے جا مردانہ تعصب کی ممانعت

کبھی یہی تعصبِ منزلی (گھریلو) زندگی میں زن وشوہر کے منصبی تفاوت سے اُبھرتا ہے۔شوہر کو چوں کہ منصبِ قوامیت (نگرانی کا منصب) دیا گیا ہے، جس سے وہ عورت کا مربی اور محافظ قرار پایا، اس کے ذمے عورت کا نان ونفقہ (خرچ) اور سُکنیٰ (رہائش) رکھا گیا ہے تو قدرتی طور پر اسے عورت پر بالادستی حاصل ہونی ہی چاہیے تھی، جو ہوئی۔عورت کو طبعی (Physical) طور پر زیردستی ملنی چاہیے تھی، جو ملی۔

لیکن اس بالادستی اور زیردستی کے فرق سے جو منصبی اور تقاضائے مناصب ہے، کوئی جاہل یا مغلوب الجذبات شوہر عورت پر اپنی ذاتی حکومت اور ظلم وستم کا مرتکب ہو، جس سے عورت میں احساسِ کمتری اور ذلتِ نفس کے خطرات اُبھرنے لگیں تو یقیناً معاشرتِ منزلی (گھریلو زندگی) بداَمنی اور بے سکونی کا شکار ہو جاتی ہے اور ایک گھر میں پھر محض زن وشوہر (عورت ومرد) کی ذاتی آویزش (لڑائی) نہیں رہتی، بلکہ صنفی جنگ چھڑ جاتی ہے۔جس سے آس پاس کا اَمن وسکون بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے اور دو صنفی گروپ بن جاتے ہیں، جو ہمہ وقت نبرد آزما رہتے ہیں۔جس سے گھریلو زندگی بداَمنی اور ہمہ وقتی تشویش کا شکار بن کر تباہ ہو جاتی ہے۔

مطلق العنان (آمر) مرد اپنے کو ایک مختارِ مطلق حاکم تصور کرنے لگتا ہے، جسے کسی ظلم وستم سے باک نہیں رہتا اور ضعیف و بے بس عورت اپنے کو ذلیل النفس اور بے سہارا دیکھ کر غم میں گھلنے لگتی ہے اور بسا اوقات اسی غم میں جاں بحق بھی ہو جاتی ہے، جو محض اس صنفی تعصب اور گھریلو تخریب کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس لیے اسلام نے اس اونچ نیچ کو بھی جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔مرد کو اگر:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (34:4) (مرد عورت کا نگراں اور سردار ہے۔)

فرما کر اس کی (عائلی) بالادستی تسلیم کی ہے، تو عورت کو

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ (228:2)

(اور عورتوں کا بھی حق ہے، جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے۔)

فرما کر اس کے احساسِ کمتری کو بھی ختم کر دیا ہے۔

اگر مرد اس قوّامیت (نگرانی) اور بالادستی سے بداَخلاق اور بدعنوانی پر آ سکتا تھا تو اس کو فرما دیا گیا کہ:

"إنّ أكرم المؤمنين أحسنكم أخلاقاً و ألطفكم أهلاً." (23)

(تم میں سب سے بہتر وہ ہے کہ، جو اَخلاق کے اعتبار سے اچھا ہو اور اپنے گھر والوں کے ساتھ نرمی برتنے والا ہو۔)

تاکہ اس کی تعدی (زیادتی) لطف و کرم سے بدل جائے اور اگر عورت وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ سے اپنے حقوق کی اس مساوات سے خاوند سے نشوز (نافرمانی) اور سرکشی پر اُتر سکتی تھی تو اسے نصِ حدیث میں یہ ہدایت دے کر اس سے باز رکھا گیا ہے کہ:

"اگر سجدہ غیراللہ کے لیے حرام نہ ہوتا تو تجھے امر کیا جاتا کہ تو اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔" (24)

تاکہ اس کی سرکشی، اطاعت شعاری سے بدل جائے۔

بہرحال مرد و عورت کے منصبی حقوق و فرائض بتلا کر ان میں اَخلاقی توازن قائم فرما دیا گیا، تاکہ ہر ایک اپنے منصبی فرائض، عدل و اعتدال اور توازن کے ساتھ ادا کرے اور منزلی (گھریلو) زندگی کو بدامنی اور نزاع و جدال (لڑائی جھگڑے) کا شکار نہ ہونے دے۔

مرد کو کہا گیا کہ تُو قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (عورتوں کا نگران) ضرور ہے، لیکن عورت کا مالک نہیں ہے کہ چاہے تو اسے بیچ ڈالے اور چاہے تو مار ڈالے، بلکہ اس کا شفیق اور محبت والا محافظ اور مربی ہے۔ عورت کو کہا گیا کہ تُو شوہر کے زیردست ضرور ہے، مگر اس کی رفیقۂ حیات ہے، رقیقۂ گردن (لونڈی) نہیں۔ تُو ذلیل النفس نہیں ہے، بلکہ واجب الاحترام اور مرد کی عزت و ناموس کی محافظ ہے۔ بہرحال کسی بھی کونے سے اسلام نے زوجین (میاں بیوی) میں صنفی یا منصبی عصبیت (جانب داری) پیدا نہیں ہونے دی کہ وہ گھریلو بدامنی کا ذریعہ بن سکے۔

جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کا اساسی مقصد بچھڑے ہوؤں کو ملانا اور بیگانہ قلوب کو یگانہ (مخلص) بنا کر ان میں محبت و مروّت اور اتحادِ باہمی پیدا کرنا ہے اور اس اتحاد کا اعلیٰ ترین ذریعہ علاقہ زوجیت (میاں بیوی کا تعلق) اور رشتۂ مصاہرت (سسرالی رشتہ) ہے۔ اس لیے انبیائے کرامؑ نے اس رشتے کو مضبوط سے مضبوط اور قوی سے قوی تر دیکھنا چاہا ہے۔ قاطع نکاح (نکاح کو ختم کرنے والی) طلاق ہے، تو اسے ''ابغض المباحات'' (حلال امور میں سب سے زیادہ قابل نفرت) فرمایا۔ عورت کا نشوز (شوہر کی نافرمانی) قاطع منافعِ نکاح (نکاح کا فائدہ ختم کرنے والا) ہے، تو ایسی سرکش عورت کو لسانِ نبوت پر ملعون بتلایا گیا۔ بیک وقت تین طلاقیں دے کر علاقۂ زوجیت (ازدواجی رشتے) کو یک دم ختم کر دینا تمام منافعِ اتحاد (ہم آہنگی کے فوائد) کو پامال کر دینا ہے، تو اس طلاق کو بدعت بتلایا۔ اور اس کے بالمقابل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو دل داری، دل جوئی اور اس کے ساتھ ملاطفت (نرمی) کو کرامتِ ایمانی (ایمانی اعزاز) فرمایا اور عملاً اس کے نمونے قائم فرمائے۔ جس کا مقصد زوجین میں وہ اَمن و سکون و مودّت (محبت) پیدا کرنا ہے، جو آگے بڑھنے والا ہو۔ کیوں کہ زوجین جس حد تک باہم مربوط اور شیر وشکر ہوں گے، اسی حد تک زوجین کے اعزہ و اقربا بھی زوجین کے حامی و مددگار بن کر شیر وشکر بنیں گے۔ جس سے قبائلی (سماجی) وحدت اور عالمی اَمن وسکون مستحکم ہوگا، جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے۔

ادھر ٹھیک اس کے بالمقابل شیاطین کا مقصد فتنہ وفساد برپا کرنا، انسانوں میں نزاع و جدال (لڑائی/ جھگڑے) سے بداَمنی اور انتشار قائم کرنا ہے، تاکہ کسی کو کسی سے چین نہ ملے اور نظامِ انسانیت تباہ و برباد ہو جائے اور اس شرّ وفساد کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ رشتۂ زوجیت کا اختلال (خلل ڈالنا) اور زوجین کی ناچاقی (رنجش) ہے، جو متعدی (پھیلنے والی) اور دُور رس ہے۔ کیوں کہ یہ دو فرد کی لڑائی نہیں، بلکہ دو گھرانوں کی لڑائی ہوگی۔ زوجین کے گھرانے اپنے اپنے کی حمایت پر کھڑے ہوں گے۔ پھر ہر گھر چوں کہ اور دوسرے بہت سے گھرانوں سے بھی متعلق ہوتا ہے، اس لیے یہ دو گھرانوں کی لڑائی دو خاندانوں کی لڑائی بن جاتی ہے۔

پھر بہت سے خاندان بستی میں بااثر اور وسیع الحلقہ بھی ہوتے ہیں، اس لیے یہی لڑائی پورے شہر کی جنگ بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ زوجین اگر مَلِک (بادشاہ) اور مَلِکہ ہیں تو یہی جنگ دوملکوں کی ہوجاتی ہے، جس سے فتنہ وفساد، نزاع (جھگڑا) ومخاصمت (بیر) اور بدامنی ہمہ گیر بن جاتی ہے، جو شیاطین کا بنیادی مقصد ہے۔

اور مسلمان تو اس اغواءِ شیطانی (شیطانی بہکاوا) کا شکار بن کر اپنوں ہی کو اُجاڑنے لگتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ (60:4)

(کیا تو نے دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس پر جو اُترا تیری طرف اور جو اُترا تجھ سے پہلے۔ چاہتے ہیں کہ قضیہ (مقدمہ) لے جائیں شیطان کی طرف، حال آں کہ ان کو حکم ہو چکا کہ اس کو نہ مانیں۔ اور شیطان تو چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر دُور جاڈالے۔)

چناں چہ حدیث کی روشنی میں:

''جب شیطانِ رجیم کے سامنے سمندر کے تخت پر اس کے شطونگڑے (چیلے) دن بھر کے اغوا و اضلال (انسانوں کو گمراہ کرنے) کی رپورٹ دیتے ہیں تو یہ رؤس الشیاطین (شیطانوں کا سربراہ) اُس شیطان کو سینے سے لگا لیتا ہے، جو زوجین میں لڑائی کرا دینے کی خبر دیتا ہے۔''(25)

کیوں کہ اس مفسدہ (فساد) کے بطن میں ہزاروں مفاسد اور کتنے ہی معاصی (پوشیدہ گناہ) پنہاں ہیں، جس میں غیبت، کذب بیانی، تہمت طرازی، ایذا رسانی اور مکر و زور (فریب اور جھوٹ) سب ہی کا استعمال ہوتا ہے اور اس خطے کا اَمن پامال ہوجاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں کہ انبیا علیہم السلام کا مقصد اَمن ومحبتِ باہمی اور اُنس ومودّت (محبت) ہے، وہ اس سے کیسے اغماض (آنکھیں بند) فرما سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس رشتے

کو ہر خطرے سے بچایا، جو محبت و اتحاد اور اُنس و مودّتِ باہمی (آپسی محبت) کا مؤثر ترین ذریعہ تھا، جیسا کہ شیاطین نے اسے پامال کرنا چاہا تھا۔

اس لیے شریعتِ اسلام نے اس رشتے سے تمام وہ تعصّبات اور اسبابِ تخریب (خرابی کے اسباب) قطع (ختم) کر دیے ہیں، جن سے زوجین میں صنفی (جنسی) عصبیت اور عرفی (رسمی) اونچ نیچ کے جذبات اُبھریں اور معاشرتی بدامنی کا ذریعہ ثابت ہوں، جس کی تفصیل عرض کی گئی۔

آج یہی صنفی بے راہ روی اور مرد و عورت کے متقابلانہ جذبات، جو دو گروپ کی صورت اختیار کر چکے ہیں، یورپ کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں اور ان کا قبائلی اور خاندانی ارتباط (میل جول) اور تعلقاتِ مودّت و محبت کا علاقہ (باہمی تعلق) پامال ہو چکا ہے، جس سے ہزاروں اَخلاقی اور سیاسی فتنے ان میں سرایت کر چکے ہیں اور زندگی کا حقیقی لطف ختم ہو گیا ہے۔

کمزور طبقات کو طاقت ور بنانے کا حکم

اسی پر اُن ضعیف و ناتواں طبقات کو قیاس کر لیا جائے، جن میں زور آور (طاقت ور) زیردست (کمزور) کو پامال کیے ہوئے ہو۔ جیسے یتیم و مسکین، غریب و نادار، بے کس و بے بس، لاوارث بیوائیں، بے وارث لڑکیاں، مصیبت زدہ یا ظلم زدہ، جن کے ضعف سے، جن کی مجبوری اور بے بسی سے زور آوروں نے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور انھیں انسانوں سے الگ گویا حیوانات کا ایک گلہ (ریوڑ) فرض کر کے ایک ذلیل گروہ بنا رکھا ہے، جس سے انسانی وحدت اور اس کا اَمن پارہ پارہ ہو رہا ہے۔

اسلام نے ان سب ضعفا کی تقویت کا سامان کیا اور آئینی طور پر زور آوروں کا زور گھٹا کر زیردستوں کی دست گیری کی، جس سے حدیث و فقہ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور یہ اصول عام اُمت کے ہاتھ میں دیا:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ (5:28)

(اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو کمزور ہوئے پڑے تھے ملک میں اور بنا دیں ہم ان کو ان کو سردار اور کر دیں ان کو قائم مقام۔)

اسلام کی امن آفرین تعلیم تمام انسانوں کے لیے ہے

اسلام کی اس اَمن آفریں تعلیم اور اَمن پرور معاشرت کو دیکھتے ہوئے جو ہر انسانی طبقے میں اس نے درجہ بہ درجہ رائج کی ہے، کیا کوئی بھی ہوش مند انسان جس میں عقل وخرد (سمجھ بوجھ) کا کوئی بھی شائبہ (حصہ) موجود ہو، اسلام کو وحشیانہ یا انفرادیت کا مذہب کہہ سکتا ہے؟ البتہ پیشانی پر اگر آنکھ ہی موجود نہ ہو تو چمکتے ہوئے سورج اور جگمگاتے ہوئے دن، اسی طرح سر میں اگر حواس وشعور کا کوئی شمہ (تھوڑا سا حصہ) ہی نہ ہو تو اسلام کی اس کھلی ہوئی اَمن پروری اور اَمن آفرینی کا انکار بھی ممکن ہے۔ ورنہ اسلام کا کلی اُصول (ضابطہ) جس کے نیچے یہ تمام مختلف الانواع جزئیات کا ذخیرہ پھیلا ہوا ہے، وہ یہ ہے:

"**لا ضَرر و لا ضِرار فی الإسلام.**" (26)

(اسلام میں نہ ابتدائی ضرر رسانی ہے نہ جوابی ضرر رسانی ہے۔)

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط (78:22)

(اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل۔)

"**خير النّاس من ينّفع النّاس.**" (27)

(بہترین آدمی وہ ہے، جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔)

"**احبّ لأخيک ما تحبّ لنفسک.**" (28)

(اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو، جو اپنی ذات کے لیے پسند کرو۔)

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (90:16)

(اللہ حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا۔)

خُذِ الْعَفْوَ (199:7) (درگزر کی عادت بناؤ۔)

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ط (17:31)

(اور سکھا بھلی بات اور منع کر برائی سے اور تحمل کر جو تجھ پر (مشکل آن) پڑے)

''إنما بُعثتم ميسّرين و لم تُبعثوا معسّرين.'' (29)

(بے شک تم آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ تنگی پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔)

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۚ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ (128:4)

(اور صلح خوب چیز ہے اور دلوں میں حرص پائی جاتی ہے۔)

غرض مثبت (اوامر) اور منفی (نواہی) دونوں ہی پہلوؤں سے اسلام نے امنِ باہم، بقائے باہم، اجتماعیتِ ملت، سلم و سلامتی ایسے ہمہ گیر فطری اصول ارشاد کیے کہ جن کا قدرتی نتیجہ عالمی اَمن اور بین الاقوامی یکجہتی کے سوا دوسرا نہیں نکلتا، جس کے تحت منزلی (گھریلو) اَمن، شہری اَمن، تمدنی اَمن اور قومی اَمن خود بہ خود قائم ہوجاتا ہے اور تعصب وتخرب اور مابینی فرقت و جدال (باہمی فرقہ واریت اور جھگڑے) سے دنیا کو نجات مل جاتی ہے، جسے عالمی اَمن کے سوا اَور کیا عنوان دیا جاسکتا ہے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے اس تاریخی دور میں جسے روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے، جس میں اندرون تاریک ہے اور بیرون روشن ہے اور جس میں اختلاف وفساد ذات البین (لوگوں کے درمیان دنگا فساد) اور بداَمنی اور بے چینی کا کوئی بھی محرک ایسا نہیں ہے، جس نے زیرِعمل آکر بنی نوعِ انسان میں تباغض اور تحاسد (باہم بغض وحسد)، پارٹی فیلنگ اور فرقہ وتفرقہ انگیزی کی گہری بنیادیں استوار نہ کردی ہوں اور جو حقیقی معنی میں:

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۚ (65:6)

(اور بھڑادے تم کو مختلف فرقے کرکے اور چکھادے ایک کو لڑائی ایک کی۔)

کا صحیح مصداق ہے۔ اگر اس دور کو عالم گیری اَمن اور علمی یک جہتی مل سکتی ہے تو صرف اسلام اور اسلامی اصول ہی کے دَامن میں مل سکتی ہے۔

امنِ عالم کے نام نہاد نظام ہائے حیات

آج دنیا میں امنِ عالم کے نام پر رنگ برنگ کے ہزاروں اِزم بن رہے ہیں اور عجائب الفکر (فکری عجائبات پر مبنی) آئین وقوانین وضع کیے جارہے ہیں، جن کی دعوتوں

اور چہار سمتی (چاروں طرف کی) پکار سے دنیا کے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے ہیں، لیکن جب تجربات کی عملی دنیا میں ان کی تلخیاں اور مضرتیں (نقصانات) سامنے آتی ہیں اور دنیا بجائے امنِ باہمی کے اور اُلٹی بدامنی، بے چینی، بے سکونی اور منافرتِ باہمی کا پہلے سے زیادہ شکار ہوتی چلی جا رہی ہے تو یہی اِزم ساز طبقے بلا اظہارِ ندامت ان میں ترمیمات کے پیوند لگانے شروع کرتے ہیں۔ جس سے ان کا نقشہ اور بھی زیادہ بھدا اور مفسدہ خیز (فساد بھرا) ہوجاتا ہے۔ تو پھر کسی دوسرے اختراعی اِزم (خود ساختہ نظام) کی بنیاد پڑتی ہے اور اس طرح سینکڑوں اِزم تو پیدا ہوچکے ہیں اور سینکڑوں ہی وفات پاچکے ہیں، لیکن اَمن کا نتیجہ صرف صفر ہے۔

تعجب ہے کہ ان ازم سازوں کی نگاہ اس خدائی اِزم پر کیوں نہیں پڑتی، جس کا تجربہ صدیوں سے ہوتا آرہا ہے اور جس کے سائنٹیفک اصول اٹل اور ناقابل ترمیم وتنسیخ ہیں۔ حیرت ہے کہ ان اِزم سازوں کو نئے نئے اِزموں کی توڑ پھوڑ اور اِزم تراشیوں سے اتنی فرصت کیوں نہیں ملتی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے دماغوں سے الگ ہوکر دلوں کی طرف متوجہ ہوں۔ دل کا کام دماغ سے لینا چھوڑ دیں اور اس اِزم کی طرف متوجہ ہوں، جو دماغوں کا تراشیدہ (بنایا ہوا) نہیں، بلکہ پاک دلوں پر نازل شدہ ہے۔ مخلوق کی اختراع (تخلیق) نہیں، بلکہ خالق کائنات کا وضع فرمودہ (بنایا ہوا) ہے۔ اور اس ربِ دو عالم کا مرتب کردہ ہے، جو ازل سے ابد (اوّل سے آخر تک) اپنی پیدا کردہ مخلوق کی نفسیات کا محیط (مکمل) علم رکھتا ہے اور اس علم محیط ہی سے اس نے یہ محیط الکل اِزم (کل انسانیت کا مکمل نظام) بنا کر دنیا کے لیے بھیجا ہے۔ جس میں نہ ترمیمات لانے کی مشقت درکار ہے، نہ ردّ وتنسیخ کی کاوشیں برداشت کرنے کی۔

اسلام کے فطری سوشلزم کی اہمیت

اگر دنیا کے کچھ اَور بُرے دن ابھی باقی ہیں تو اس غفلت اور پہلوتہی کی بات دوسری ہے، لیکن اگر دنیا کے بھلے دن آگئے ہیں تو بلاشبہ اسلام کا ہی اٹل قانون اور فطری سوشلزم دنیا

پر لاگو ہوکر رہے گا اور طوعاً یا کرہاً (بہ خوشی یا زبردستی)، بدیر یا بسویر (جلد یا دیر سے) اس کی طرف آکر رہے گی کہ اس کے بغیر اُس کے اَمن چین کا سانس لینے کی اَور کوئی صورت نہیں۔

اس لیے اسلام کے عالمی اَمن کا پیغام اور ہمہ گیر پروگرام عوام وخواص اور امرا و حکام کو پکار پکار کر آواز دے رہا ہے کہ اس کے بخشے ہوئے امنِ ظاہر و باطن کی طرف آئیں۔ جس پر بالآخر دنیا کو آنا ہے، خواہ بہ رغبت و مہر (اپنی رغبت اور اُلفت سے) یا بہ کراہت وقہر (مجبوراً)۔ چناں چہ ارشادِ نبوی ہے:

"لا یبقیٰ علیٰ ظهر الأرض بيت مدر و لا دبر إلا أدخله اللّٰه كلمة الإسلام بعزّ عزيز و ذلّ ذليل فيكون الدّين كلُّه لِلّٰه." (30)

(زمین کی پشت پر کوئی مٹی کا گھر اور خیمہ ایسا باقی نہ رہے گا کہ اللہ اس میں اسلام کا کلمہ (نظام) داخل نہ کردے، عزت کے مستحق لوگوں کی عزت عطا کر کے اور ذلت کے حق داروں کو ذلیل کر کے۔ پھر تو دنیا میں مکمل اطاعت صرف اللہ ہی کی ہوجائے گی۔)

آخری نصیحت

ما نصیحت بجائے خود کردیم
روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوشِ رغبت کس
بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(ہم نے اپنی ہمت کے مطابق نصیحت کی اور ہم نے ایک زمانہ اس میں لگا دیا۔ اگر کوئی اپنی رغبت سے اس بات کی طرف متوجہ نہ ہوا تو رسولوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے اور بس۔)

(ماخوذ از مجموعہ رسائل حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
ص: 125 تا 158، طبع: مکتبۃ الاحرار، مردان)

خطبے کے نکات کا خلاصہ

زیرِ نظر خطبے میں جو اہم نکات زیرِ بحث آئے ہیں' یہ ہیں۔

1۔ اسلام کا مادہ (Source) سلم ہے، جس کے معنی سلامتی اور اَمن کے ہیں۔

2۔ اسلام ایک اَمن دوست، اَمن کو فروغ دینے والا اور اَمن کا علم بردار دین ہے۔

3۔ بداَمنی اور انتشار پسندی اسلام سے اس طرح الگ ہے، جس طرح سورج سے ظلمت اور چمکتے ہوئے دن سے اندھیری دور ہے۔

4۔ اسلام کا پیغامِ اَمن محض مقامی، وطنی، قومی نہیں بلکہ عالمی اور آفاقی ہے۔

5۔ اسلام ساری اقوام و اُمم کو باہم شیر وشکر کرنا چاہتا ہے۔

6۔ اسلام کے اصول اور ذیلی قوانین عالمی اَمن کے ضامن ہیں۔

7۔ اسلام کا اہم حکم امانت ہے، جس کا مادہ بھی اَمن ہے۔

8۔ باہمی ملاقات کے وقت حضورﷺ کی طرف سے سلام کرنے کا حکم بھی اَمن پسندی کو فروغ دینے کے لیے ہے۔

9۔ اسلام نے مسلمان ہونے کی پہچان ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچانا بتایا ہے۔

10۔ دوسرے انسان کی توہین، مذاق اڑانا، جان و مال کو خطرے میں ڈالنا اسلام میں حرام ہے۔

11۔ دوسروں کو تکلیف دہ چیزوں سے بچانا' حدیث کی روشنی میں ایمان پر عمل کا ابتدائی درجہ ہے۔

12۔ فتنہ پھیلانے والے پر حضورﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔

13۔ حدیث کی روشنی میں فتنہ پھیلانے والا' دین کو مونڈنے والے کے مترادف ہے۔

14۔ صلہ رحمی اور اخوت کا دینی حکم مسلم معاشرے کو وحدت کی کلید عطا کرتا ہے۔

15۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو جسم واحد قرار دے کر معاشرتی تفریق وتقسیم کی جڑ کاٹ دی ہے۔

16۔ خطبہ حجۃ الوداع میں حضورﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام انسان آپس میں رشتہ اخوت میں منسلک ہیں۔''

17۔ حضورﷺ نے تمام مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دیا ہے اور جو اس کے کنبہ (مخلوق) کے

ساتھ حسن سلوک کرے گا وہ اللہ کے نزدیک سب انسانوں سے بہتر ہے۔

18۔ اسلام میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کی ایذا رسانی بھی ممنوع ہے۔

19۔ غیر مسلم مظلوم کی بقدر استطاعت مدد کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔

20۔ قرآن نے ایک انسان کے قتل کو کل انسانیت کا قتل قرار دے کر انسانی زندگی کی حفاظت (بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب) کی بنیاد فراہم کر دی۔

21۔ قبل از بعثت حضورﷺ کو عربوں نے امین کا پرشکوہ لقب دے کر اس یقین کا اظہار کیا کہ آپؐ اَمن پسند ہیں۔ امین کا مادہ اَمن ہے۔

22۔ نبوت ملنے پر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی تسلی کی خاطر جو کلمات کہے وہ آپؐ کے بلند اخلاق پر فائز ہونے کے اظہار اور تعلیمات نبویؐ کا نچوڑ ہونے کی بنا پر اخلاق انسانیت اور مسلم معاشرت کا معیار ہیں۔

23۔ اسلام کے تصورِ جہاد کی روح قیام اَمن ہے۔ اس لیے عین لڑائی کے وقت اعلیٰ انسانی اقدار کا لحاظ کرنے کا حکم ہے۔

24۔ اسلام کا تصور جہاد وقتال ظلم کے خاتمے، فروغِ اَمن اور قیامِ حقوقِ انسانی کے لیے ہے۔

25۔ ہر دائرے اور ہر پہلو سے بداَمنی، انتشار پسندی اور تفرقہ اندازی کی جڑیں اسلام نے اکھاڑ کر پھینک دی ہیں۔

26۔ احادیث میں مختلف ممالک کے مناقب کا تذکرہ اس لیے ہے کہ ایک انسانیت پسند شخص تمام ممالک کی وطنی اہمیت کو سمجھے۔

27۔ اسلام عالمگیر دین ہے اور ہر وطن کے لیے یکساں پیغام دیتا ہے۔

28۔ اسلام انسانوں کے درمیان اونچ نیچ اور طبقاتیت کو ناپسند کرتا ہے۔

29۔ آقا اور غلام کے حد سے بڑھے ہوئے فرق کو اسلام نے ممکنہ حد تک کم کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں علماء و مشائخ غلاموں کی نسل سے ہوئے۔

30۔ اسلام آمریت کا مخالف ہے۔

31۔ اسلام نے مرد و عورت کے حقوق میں توازن پیدا کیا۔

32۔ اسلام مسلمانوں کو بطور فریضہ کے کہتا ہے کہ انسانی بھلائی اور سہولت کی خاطر قربانی دیں۔

33۔ اسلام فطرت اور حقیقی اجتماعیت کا نمائندہ ہے۔

حوالہ جات

1. احمد بن حنبل(م:241ھ)/مُسند المکثرین من الصحابہ، حدیث نمبر 11975.
2. البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبداللّٰہ (م:256ھ) الجامع الصحیح، حدیث 12.
3. البیھقی، احمد بن حسین، ابوبکر (م:458ھ)، شعب الایمان. حدیث 4666.
4. المسلم، نیشاپوری، ابو الحسین، مسلم بن حجاج (م26ھ) الجامع الصحیح. حدیث 73.
5. احمد،مسند احمد. حدیث نمبر8918.
6. المسلم، الجامع الصحیح، حدیث نمبر3551.
7. علی المتقی بن حسام الدین، علاؤالدین، الھندی، البرھان پوری (م: 975ھ)، کنزالعمال فی سنن الاقوال والافعال. حدیث نمبر30891.
8. الترمذی، ابوعیسی (م:279ھ) السنن. حدیث نمبر2509.
9. احمد،مسند احمد.حدیث نمبر17907.
10. احمد، مسند احمد.حدیث نمبر19508.
11. الطبری، محمد بن جریر، ابوجعفر (م:301ھ)، معجم الکبیر،86؛ ابویعلی، 65:6.
12. البخاری، الجامع الصحیح.حدیث نمبر4.
13. ایضاً.
14. احمد، مسند احمد.حدیث نمبر19508.
15. ابو محمد (م:620ھ)، المغنی لابن قدامۃ، 156:8.
16. البخاری، الجامع الصحیح. حدیث نمبر437.
17. ابوداؤد، سجستانی، سلیمان بن اشعث (م:275ھ)، السنن. حدیث نمبر666.
18. البخاری، الجامع الصحیح. حدیث نمبر3412.
19. احمد، مسند احمد، باقی مسند الانصار.
20. احمد، مسند احمد، مسند بنی ھاشم.
21. الترمذی، ابوعیسی، السنن، حدیث نمبر 3956.
22. البخاری، الجامع الصحیح.حدیث نمبر30.
23. الترمذی، ابوعیسی، السنن، حدیث نمبر284.
24. البخاری، الجامع الصحیح.حدیث نمبر 2140.
25. ابوداؤد، السنن، حدیث نمبر 2140. المسلم، الجامع الصحیح، حدیث نمبر5032.
26. ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابوعبداللہ (م:273ھ)، السنن،2/784.
27. کنزالعمال، 44154.
28. البخاری، الجامع الصحیح. حدیث نمبر13.
29. ابوداؤد، السنن، حدیث نمبر380.
30. احمد، مسنداحمد. حدیث نمبر 2330.

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان